جنّت بی بی

جنّت بی بی

کرنل (ر) سید شفاعت علی

جنّت بی بی

ناول

کرنل (ر) سیّد شفاعت علی

تمغۂ قائد اعظم، تمغۂ امتیاز (ملٹری)

چیتنا پرکاشن

پنجابی بھون، لدھیانہ۔

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

Before this ...

Gard-e-Carwan	2002
Gubar-e-Askari	2005
Zafran-e-Askari	2006

انتساب

دلّی

کے کارخنداروں

کے نام

JANNAT BIBI

A Novel by

Col. Syed Shafaat Ali
TQA, TI(M)
14371-74A Avenue
Surrey B.C. V3W ON3
CANADA
PH. 604-599-7067
E-mail : colshafaat@yahoo.com

مصنف: کرنل سیّد شفاعت علی ©

سنِ اشاعت: 2006

پبلشر: **چیتنا پرکاشن** پنجابی بھون، لدھیانہ۔

کمپیوٹر کمپوزنگ: محمد رفیق، سرے کینیڈا

پرنٹرز: آر۔ کے۔ آفسیٹ، دہلی۔

قیمت: $10 Rs. 200

ISBN : 81-7883-260-7

کتاب کے حصول کے لئے پتہ:

TITLE : Jannat Bibi :nāvil /
AUTHOR STAT : Sayyid Shafā'at 'Alī.
IMPRINT : Ludhyānah : Cetnā Parkāshan, 2006
NATURE SCOPE : A novel.
LANGUAGE : In Urdu; includes passages in English.
D.K Agencies (P) Ltd. DKURD-3830
www.dkagencies.com

☆☆☆ سرورق ڈیزائن مصنف کا شاہکار ہے ☆☆☆

فہرست

پیش لفظ

دُنیا ایک نوٹنکی کی مانند ہے۔ ایک منڈوا لگا ہوا ہے، مداری آتے ہیں اور اپنا کرتب دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ میں بھی اپنی زندگی میں تماشائی رہ چکا ہوں۔ ایک خاموش تماشائی۔ کیا کچھ نہ دیکھا اور اُف تک نہ کی! الاماں، الحفیظ۔ اب جب میری کمر جھک رہی ہے اور طاقِ نسیاں اُبھرتا معلوم ہوتا ہے تو اس پر نقش و نگار بنانے کو طبیعت چاہتی ہے۔ چاہتا ہوں کہ اس کو اُن مورتیوں سے سجاؤں جو کبھی میری زندگی کا حصہ بنی رہیں۔

کوئی اینٹ یہاں سے لی، کوئی روڑا وہاں سے اُٹھایا اور لیجیے بھان متی نے رشتہ جوڑ لیا۔ ناول بن گئی۔ دلچسپ اور قابلِ غور حقیقت یہ ہے کہ ان سب ہستیوں نے منڈوے پر آ کر کرتب دکھایا تھا اور میں نے اپنی آنکھوں سے انکا کرتب ضرور دیکھا تھا۔

میرے خاندان میں بہت مہذب لوگوں کے علاوہ ایک سے ایک کارخندار موجود تھا۔ ایسے طعنے باز کہ اگر کنول انکی بات سُن لیتا تو ناگ پھن کا رُوپ اختیار کر لیتا۔ ان ہستیوں میں نہایت روشن دماغ اور نیک لوگ موجود تھے۔ زیب دیتا تھا اگر ان کو صُوفی کہتے اور ایسے روشن دماغ لوگ بھی موجود تھے کہ اگر انکو مرزُود کہا جاتا تو ان کی غیر حاضری میں ان کی شکل سامنے آ جاتی۔

میری زندگی میں کیا، ہم سب کی زندگیوں میں صنفِ نازک کا رول بہت اہم رہا ہے۔ اس ہی کے وجود سے ہم سب لوگ وجود میں آئے۔ لیکن تجربے نے یہ بتایا کہ ایک دوشیزہ جب اسّی سال کی ہو جائے تو اس کے لچھن ذرا مختلف ہو جاتے ہیں۔ جنت، اس ناول کی ہیروین، کے ساتھ بھی یہی ہوتا رہا۔ اس باہمت لڑکی نے سب کا مقابلہ کیا اور کامیاب اُبھری۔

شفاعت علی: سرے، کینیڈا

عنوان	صفحہ نمبر

۱۹۷۰ء

برسوں سے مکان پر سفیدی نہیں ہوئی تھی۔ جگہ جگہ سے پلاسٹر اُکھڑ چکا تھا۔ جگہ جگہ کائی لگ چکی تھی۔ کبھی مکان میں چہل پہل نہ دیکھی گئی تھی۔ کبھی کبھار برامدے میں ہڈیوں کا ڈھانچہ آتا، جالی میں سے باہر جھانکتا اور غائب ہو جاتا۔ بچوں نے اس مکان کو ''بھوت گھر'' مشہور کر رکھا تھا۔

جھٹپٹے کا وقت تھا۔ اندھیرا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس آسیب زدہ مکان کے دروازے پر بجلی کے تار سے گھنٹی کا بٹن لٹک رہا تھا۔ اس بٹن کے پاس دو خواتین آ کر کھڑی ہوئیں۔ دونوں نے مغربی لباس کی فراکیں پہنی ہوئیں تھیں۔ دونوں ہم عمر لگتی تھیں۔ انکی رنگت اور چہرے کے نقش و نگار بتا رہے تھے کہ انکا ہندوستان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ دونوں میں فرق اتنا تھا کہ ایک کے لمبے سنہری بال لہرا رہے تھے اور دوسری نے عربی حجاب میں اپنا ایک ایک بال چھپا رکھا تھا۔ گھنٹی کے لٹکتے ہوئے تار کو دیکھ کر دونوں پریشان سی ہوئیں، پھر ایک نے گھنٹی کا بٹن پکڑا اور دوسری نے بٹن دبایا۔ گھنٹی کام کر رہی تھی، بجی۔ لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر گھنٹی بجائی گئی۔ برآمدے کی تاریکی میں سے ہڈیوں کا ڈھانچہ سفید کپڑے کی لمبی سی قمیض پہنے ہوئے آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر انگریز خواتین کا سایہ دیکھ کر واپس جانے لگا۔ خواتین مستقل مزاجی سے کھڑی رہیں۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ کوئی

بھوت نہ تھا بلکہ زندہ انسان تھا۔ ایک خاتون نے "ہیلو" کہہ کر ڈھانچے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ڈھانچے نے آہستہ آہستہ عورتوں کی طرف قدم بڑھائے۔ قریب آکر بہت دھیمی آواز میں پوچھا: "کون ہے۔ کون ہیں آپ لوگ؟ یہ ملنے کا وقت نہیں"۔ وہ عورت جس کے سنہرے بال تھے، اُردو میں بولی "ہمیں شہاب الدین صاحب سے ملنا ہے" اور جواب سننے کے لئے اپنے کان ڈھانچے کی طرف کئے۔ ڈھانچے سے بمشکل آواز نکلی:: "وہ تو سو گئے ہوں گے...ملنا مشکل ہے...... آپ لوگ کون ہیں؟" میں ڈاکٹر مارلین ولسن ہوں اور یہ ڈاکٹر رضوان ہیں۔" مریض کے دیکھنے کا یہ کون سا وقت .....نکالا۔ ہم نے تو نہیں بلایا...آپ کیوں آئی.... ہیں؟" "ہم شہاب الدین صاحب سے لندن سے ملنے آئے ہیں۔" ڈھانچے نے کچھ سوچا، پھر اپنا منہ موڑا اور پھر کچھ سوچا۔ گردن گھما کر ان عورتوں کو دیکھا، پھر کچھ سوچا اور آہستہ آہستہ ڈھانچہ برآمدے کی تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد برآمدے کی لائٹ جلی اور ڈھانچے نے اندر بلایا اور کہا "شہاب الدین صاحب بیمار ہیں" ڈھانچہ اپنا سینہ پکڑ کر کھانسنے لگا اور پھر زور سے کھانستا رہا۔ اس وق کے مریض نے بہت تکلیف کے ساتھ آہستہ آہستہ اور بہت نحیف آواز میں بڑبڑایا، کیا کریں گے....آپ لوگ...شہاب الدین صاحب سے.....مل کر.....وہ کسی سے ملتے ....ملتے ملاتے نہیں ....دیکھئے میں نے انہیں.....مطلع کیا ہے آپ بیٹھ جایئے۔" اور اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا، اپنے قدم ناپتا ہوا آہستہ آہستہ وہ ڈھانچہ کمرے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

کمرے میں، جسے ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا، ایک چھوٹا سا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی ایک لالٹین کی روشنی سے بیش نہ تھی۔ کمرے میں بہت گھٹن تھی، شاید کئی روز سے کمرہ کھلا نہیں تھا۔ چھت میں سے چمگادڑ باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کی روزی کا وقت آچکا تھا۔ آسیب زدہ ماحول کو خواتین سمجھنے کی کوشش کر رہی

تھیں۔ کمرہ کسی عامل کی کوٹھڑی معلوم ہوتا تھا۔ تین کرسیاں ایک لائن میں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر کھجور کے پتوں سے بنا ہوا پنکھا رکھا تھا کہ اگر کسی کو گرمی لگے تو جھل کر پسینہ خشک کر لے یا جادوئی تاثیر دور پھیلا دے۔ یہی ایک ایسی چیز تھی جو استعمال میں معلوم ہوتی تھی ورنہ ہر شے گرد آلود تھی۔ کونے میں پرانے زمانے کی ایک الماری رکھی ہوئی تھی۔ حجاب کو ٹھیک کرتی ہوئی خاتون الماری کے پاس گئیں اور اس کا دروازہ کھولا۔ زنگ آلود الماری کے قبضوں سے کڑ کڑ کی آواز نے کمرے کی خوفناک خاموشی کو توڑا۔ الماری میں ہاتھ کی بنی ہوئی کپڑے کی گڑیا سجی ہوئی تھی۔ گڑیا کے چاروں طرف مکڑیوں نے اپنا گھنا شہر آباد کر لیا تھا، وہ زیور سے سجی ہوئی تھی۔ اس نے نتھ پہنی ہوئی تھی۔ خاتون کی آواز ایسے گونجی جیسے کسی نے گنبد میں سرد آہ بھری ہو ''گلشن! ابھی تک سجی بنی بیٹھی ہو؟ ابھی تک نتھ نہیں اتاری؟''۔

جان لیوا خاموشی کے بعد ایک بزرگ خاتون جھکی ہوئی کمرے میں جوتیاں زمین پر رگڑتی ہوئی داخل ہوئیں اور کہا'' ڈاکٹروں کو اندر بلایا ہے'' اور منہ موڑ کر، راستہ دکھاتی ہوئی، آہستہ آہستہ دوسرے کمرے کی طرف جانے لگیں۔ نو وارد خواتین انکے قدموں پر قدم رکھتے ہوئے دوسرے کمرے میں پہنچ گئیں۔ وہاں پلنگ پر ایک بزرگ آرام فرما رہے تھے۔ داڑھی سفید ہو چکی تھی، جسم لاغر ہو چکا تھا، آنکھیں چندھیا چکی تھیں، آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ بار بار کھانستے تھے۔ بولنے میں دقت محسوس کر رہے تھے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ ٹمٹماتی روشنی میں دو مغربی خواتین کا ہونا وہم سا معلوم ہوا۔ نہایت پریشانی کی حالت میں انہوں نے پوچھا: ''کیا ہے؟........ ڈاکٹر ہیں؟، کون ہیں آپ لوگ؟''۔ حجاب والی خاتون سسکیاں لینے لگی، لیکن سنبھالا لیا۔ ادب کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور کہا:

''ابا ... جنت آئی ہے''

''کون جنت؟.... میں دوزخی ہوں، یہاں جنت کا کیا کام؟، میری جنت کھو چکی ہے....
تم کون ہو؟ ڈاکٹر ہو؟'' ''ابا، آپ کی بیٹی... جنت! جنت شہاب الدین''
بزرگ آنکھیں بند کر کے سوچنے لگے، تھوڑی دیر کے بعد بزرگ نے عینک ٹٹولی، عینک لگائی
، پھر غور سے حجاب والی عورت کو دیکھا۔ ''تو اپنے آپ کو جنت کہتی ہے؟....لا دکھا؟
اپنے بائیں پیر کا مسہ... بتا تو کون ہے؟'' عورت نے اپنا جوتا اُتارا موزہ اُتارا اور پیر
پلنگ پر رکھ دیا۔ بزرگ نے اپنی عینک کو پھر درست کیا، مسہ ٹٹول کر دیکھا، چیخ نکلی
''جنت'' ہاتھ ہوا میں اٹھا دیے...... ''جنت''۔ اب وہ خاتون زار و قطار رو رہی تھی۔
منہ سے صرف ''ابا'' ''ابا'' نکل رہا تھا۔ کمرہ سسکیوں سے بھر گیا۔ بڈھا باپ بچوں
کی طرح رو رہا تھا، بیٹی بڑوں کی طرح اپنے آپ پر قابو نہ پا سکی۔ الفاظ کی گتھی باپ اور
بیٹی کے گلے میں پھنس گئی۔ وقت بولنے کا نہ تھا، دل کی دھڑکنوں کو پہچاننے کا تھا۔ باپ
کے خون نے، بیٹی کی رگوں میں طوفان لا کھڑا کیا تھا۔ باپ کا جسم ابھی تک گرم تھا اور
باپ کی گود کی گرمائی بیٹی اچھی طرح پہچانتی تھی۔ سکون سے چمٹی رہی۔ خاتون کی کمر پر
ایک بزرگ خاتون نے ہاتھ سے تھپکی دی اور پوچھا: ''کیا جنت کی لاش لائی ہو؟''۔
لڑکی نے خاتون کے چہرے کو غور سے دیکھا اور چیخ ماری ''اماں! نہیں اماں تمہاری
جنت زندہ آئی ہے۔تمہارے پاس....اماں!'' خاموشی طاری ہوئی۔ آنکھیں چندھیا
کر بڑھیا نے لڑکی کو فوکس کرنے کی کوشش کی۔ ''تو کون ہے؟....ڈاکٹر ہے؟.......
میری بیٹی مر گئی تھی .....دو پٹہ پہنتی تھی....مر گئی! ...مر گئی!...اری تو نے دو پٹہ کیوں نہیں
پہنا...تو عربی ہے؟.... یہاں کیا لینے آئی ہے....اس بڈھے کا علاج کرے گی؟ ...جا...
پھر آنا....تب تک بڈھا مر چکا ہوگا''۔

بزرگ چیخے ....'' یہ پاگل ہو چکی ہے۔ میری بیٹی یہاں سوائے میرے کوئی
ہوش میں نہیں۔ یہ مجھ کو نہیں پہچانتی..... یہ تیری ماں ہیں....تو رو لے جتنا رو سکتی ہے...

رو لے۔ اب تو انکی آنکھوں میں آنسو بھی خشک ہو چکے ہیں.... بیٹی رو لے ...رو لے اور چمٹ جا اپنی ماں سے اور چٹنی رووان سے.... تیرے جسم میں ان کا دودھ ہے۔ شاید جوش میں آ جائے۔ تو ان کی کوکھ سے نکلی ہے تو ان کے خون سے بنی ہے...لپٹی رووان سے.... شاید یہ اپنے خون کے عناصر کو پہچان لیں۔'' بڑھیا کے ہاتھوں کی گرفت کبھی کبھی سخت ہونی شروع ہوئی۔ بڑھیا نے بُڑبڑانا شروع کیا:''جنت...جنت...جنت...تو ڈاکٹر ہے تو میری میری جنت.. میری جنت کہاں ہے؟ میری جنت کو تو نے کہاں مارا؟''

اس گھر میں اتنے طوفان آچکے تھے کہ ہر فرد ٹوٹ چکا تھا۔ چکنا چور ہوا اس کھنڈر میں پڑا تھا لیکن اس کو ارژ کو نہ چھوڑتا تھا۔ لاغر جسموں میں کچھ روحیں اٹکی ہوئی، کبھی کبھار اپنے ماضی کو ڈھونڈنے نکلتی تھیں۔ یادوں کے ساکن اور غلیظ تالاب میں کوئی پتھر مار کر پانی میں اضطراب پیدا کر کے چلا جاتا تھا۔ آج بھی یہی ہو رہا تھا۔ یادوں کی چٹان آگری تھی۔ تالاب کا سکوت ٹوٹنے سے جو تعفن پھوٹا تو بے ہوشی طاری ہونے لگی تھی۔ ماضی نے اب ایسا پلٹا کھایا کہ حال معلوم ہونے لگا۔ آندھیاں سی آنے لگیں۔ بگولوں میں شخصیتیں تیرتی نظر آنے لگیں۔ ہر طرف سینما کی اسکرینیں نظر آنے لگیں، طرح طرح کی فلمیں دکھائی جارہی تھیں۔ معصوم خوشیاں، بچی کی فرمائشیں، بزرگوں کی ضد، الزام تراشیاں.... ہر ایک خود ہیرو بنا ہوا تھا۔ ہر ایک خود ہیروئن بنی ہوئی تھی۔ ٹریجیڈی بھی تھی اور کامیڈی بھی۔ وقت نے ایسا ریورس گیئر لگا لیا تھا اور رُکتا نہ تھا۔ جنت، جنت کا بچپن، دادی ماں کی ضد، جنت کی منگنی، جنت کی زبردستی کی شادی ....نئی دہلی، ترکمان دروازہ، میر درد روڈ......سب کے سب، سب کے سامنے آکر، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، ہنس ہنس کر سوالی تھے۔ جنت کی داستان دہرارہے تھے۔

ترکمان دروازہ

چرخِ کہن، اپنے پٹارے سے ہندوستان کے دارالخلافہ کو، حسبِ تاریخ نئے نئے نام سے شہرت دیتا رہا اور اس کو لٹواتا رہا ہے۔ اس کی شعبدہ بازی کی تو نقش و نگار طاقِ نسیاں شہادت دیں تو دیں۔ کبھی اس آبادی میں اندر پرست کا ڈنکا لگوایا اور کبھی جہاں آباد کو آباد کیا۔ انگریز کی گوری زبان پر اس شہر کا کالا نام چڑھ کر ہی نہ دیا۔ وہ ''ڈیل ہی'' ''ڈیل ہی'' کہتے ہوئے راہیِ ملکِ انگلستان ہوا.... اور دنیا میں مشہور کر دیا کہ ہندوستان کا دارالخلافہ ''نیو ڈیل ہی'' ہے۔ مگر یہ کمبخت نگری، بے غیرت، ڈھیٹ، دہلی، دلّی کی دلّی رہی۔

اس سونے کی چڑیا کے پنجرے کو محفوظ کرنے کے لئے قدیم حکمرانوں نے دلّی شہر کے ارد گرد دیوار بنوائی تھی جس کو فصیل کہا جاتا تھا مگر انوکھے دلی والے اس کو ''صفیل'' کہتے تھے۔ اس صفیل کے جنوبی علاقے میں تین دروازے رکھے گئے تھے۔ جمنا کی طرف دروازہ ''دہلی دروازہ'' کہلایا جاتا تھا۔ اس کے مغرب میں ''ترکمان دروازہ'' اور پھر اجمیر کی طرف ''اجمیری دروازہ'' کہلایا جاتا تھا۔ ترکمان دروازے کے جنوب میں رام لیلا کا وسیع میدان ابھی تک اپنے سینے پر رام لیلا کا میلہ منعقد کروا کر اپنے سینے پر مونگ دلواتا رہا ہے۔ اسی میدان کے سامنے انگریزوں نے اپنے دیسی سٹاف کو بسانے کے لئے گورنمنٹ کوارٹر بنوائے تھے۔ ان کوارٹروں میں گورنمنٹ کے ہر درجے کا دیسی سٹاف مکین تھا۔

پُرسکون زمانہ تھا۔ ۱۹۳۶ء میں ہٹلر نے اکڑنا سیکھ لیا تھا، مگر پیرا بھی تک نہیں جمے تھے۔ ایڈورڈ کا روپیہ پورے ایک تولہ چاندی کا ہوتا تھا۔ بہت سے کام دھیلے اور ٹکے میں ہو جاتے تھے۔ اگر جیب میں چونی فالتو ہوتی تو جوانی میں خلل آنا شروع ہو جاتا تھا۔ ساون میں ابرِ سیاہ جھوم جھوم اٹھتا اور ہفتوں برستا۔ آم کھانے کا شمار گٹھلیوں کے ڈھیر سے ہوتا۔ گرمیوں میں جب شب مہتاب دل کھول کر بے نقاب ہوتی تو پلنگ پر چنبیلی کے پھول ضرور سجائے جاتے۔ رات کتنی گزری؟ یہ منہ میں گلوری کا مزہ بتاتا تھا۔ اور کبھی گھڑی پر اعتبار نہ کیا جاتا تھا۔ دادی اماں مرغے کی اذان پر ہی اٹھ جاتیں مگر اہلِ خانہ آرام سے فجر کی اذان پر اٹھتے۔ ایسے جنت نظیر ماحول میں ایک متوسط اور مسلم خاندان میں ایک بچی نے جنم لیا۔ دقیانوسی روایات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس بچی کا نام ''جنت بی بی'' رکھا گیا۔ ترکمان دروازے کے کوارٹروں میں اس بچی نے ککڑی کی طرح بڑھنا شروع کیا۔

جنت اپنے کوارٹر کے باہر ہری گھاس کے قالین پر رسی کود رہی تھی کہ اس کی دادی اماں بے قرار ہو کر برامدے سے باہر آئیں اور آواز لگائی ''جنت اندر آؤ..... جنت سنا نہیں، میں کہتی ہوں اندر آؤ''۔ جنت نے رسی کی گردش کو روکا اور گردن ٹیڑھی کر کے اپنی دادی کو دیکھا۔ انکو منہ چڑایا اور رسی گھاس پر کھینچتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنے کوارٹر کی طرف بڑھی۔ ''گھوڑا اپنی ہوئی ہے، اچھلتی پھر رہی ہے۔ آٹھ سال کی ہو گئی ہے اور حرکتیں دیکھو۔ اب کیا گلی ڈنڈا بھی کھیلے گی۔ آ اندر آ میں تیری چٹیا ٹھیک کر دوں''۔ اور وہ اس کو اندر لے گئیں۔ ''دادی اماں، آپ نے کبھی رسی نہیں کودی؟ میں پچاس چکر پورے کر لیتی ہوں، میں آپ کو سو پورے کر کے دکھاؤں گی۔'' ''اے نوج! شریف زادیاں کوئی رسی تھوڑی کودتی ہیں۔ ہم نے چکی پیسنے کے علاوہ کوئی اور ورزش نہیں کی''۔ اور یہ کہہ کر دادی اماں نے جنت کو اپنی گود میں بٹھایا اور اس کے تیل سے تر

بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی چٹیا کے پیچ وخم میں اور ایک رسی کے توڑ مروڑ میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا تھا کہ رسی کودنے سے جنت کی کچھ لٹیں چٹیا سے نافرمانی کر کے کان کے اوپر لہرا گئی تھیں۔ دادی اماں نے ان بالوں کو کان کے اوپر سے ہٹا کر چٹیا میں چپکا دیا اور چٹیا کو ایک بار اور کس دیا۔ ''بٹیا شریف زادیاں بال کبھی نہیں لہراتیں۔ کانوں پر بال کبھی نہیں ہونے چاہییں۔ ایک ایک بال چٹیا میں کسا ہونا چاہیئے۔'' جنت چیخی ''دادی اماں بس کیجئے۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اچھی دادی تھوڑی سی چٹیا ڈھیلی کر دیں'' ہاں! تا کہ تو اچھلتی پھرے؟ بال کھول کر رسی کودے؟ ''ہاں دادی ... پیاری دادی بال کھول کر رسی کودنا کتنا اچھا لگے گا''۔ '' تجھے کیا پتہ کہ تیرے بال کتنے گھنے اور خوبصورت ہیں۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے، تیرا ماتھا تو مجھے بہت کچھ بتاتا ہے۔ تیرا مستقبل بہت تابناک ہے بیٹی''۔

''میں سلیما کی ایکٹر بنوں گی؟ ہنٹر والی؟''

''میں تیرا منہ توڑ دوں گی اگر ایسی باتیں کیں۔ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ اتنی سی عمر میں ایسی فحش باتیں کرتی ہے۔ آنے دے آج شہاب الدین کو، آج میں تیری شکایت ضرور کروں گی۔ یہ بائسکوپ دیکھنے کا نتیجہ ہے''۔

جنت ایک نوکر پیشہ خاندان میں اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے والد شہاب الدین کو فخر تھا کہ وہ گورنمنٹ آف انڈیا کے ملازم تھے۔ بڑی کش مکش کے بعد وہ آفیسر گریڈ میں آ سکے تھے۔ نپی تلی آمدنی تھی۔ خواہشات قابو میں تھیں۔ اللہ سے جو مانگا تھا وہ انکو مل چکا تھا۔ گھر کے تمام افراد، بمع جنت کے، نماز پڑھنے کے عادی تھے۔ گھریلو ماحول نہایت شریفانہ اور مہذب تھا۔ گھریلو زبان شستہ تھی مگر خواتین طعنوں کو زینتِ کلام سمجھتی تھیں اور ان سے ایسا وار کر سکتی تھیں کہ سننے والے کے کانوں کا خون کھولنے لگتا تھا۔ شہاب الدین اس امر کا خاص خیال رکھتے تھے اور اکثر خواتین کی زبان پر لگام لگاتے

رہتے تھے۔ایک روز خاکروبہ (بھنگن) نے صفائی میں لاپرواہی برتی تو دادی اماں کے منہ سے نکلا" حلال زادی نے اگال دان تک نہ چمکائے!" اتنا ہی کہا تھا کہ شہاب الدین نے ٹوکا،"اماں آپ تو کیسی گالیاں دینے لگی ہیں۔ شرفا میں ایسی زبان تھوڑی استعمال ہوتی ہے۔ بچی کا ساتھ ہے کچھ تو خیال کیجئے۔"

اللہ نے جنت کو بہت روشن دماغ دیا تھا۔اس کی آنکھوں میں قدرت نے ایسا کیمرہ لگایا تھا کہ وہ فوٹو کھینچ کر حالات کو یا کسی حقیقت کو، یا اعداد وشمار کو محفوظ کر لیتا تھا اور اللہ نے اس کو یہ قابلیت بخشی تھی کہ وہ جب چاہے اپنے محفوظ شدہ خزانہ سے جو علم نکالنا چاہے نکال لے اور اس علم کو اپنے سامنے درپیش مسئلہ پر ایسا عملی جامہ پہنائے کہ مسئلہ حل ہو جائے۔ یہ لڑکی بلند ہمت تھی اور حادثوں کی متلاشی رہتی تھی۔ مستقل مزاجی سے اپنا مقصد حاصل کرنے کے بیج اس کے خون میں گردش کر رہے تھے۔ صحت مند اور خوبصورت، وہ قدرت کا ایسا عجوبہ تھی جو شاذ و نادر ہی پیدا کئے جاتے ہیں۔ غیاث الدین بلبن کی اولاد میں سے، جنت دادی اماں کی پوتی تھی۔

جنت کی تعلیم ایک مشن اسکول میں شروع ہوئی تھی۔ نئی دہلی میں ریڈنگ روڈ پر Saint Thomas اسکول کی کنڈرگارٹن کلاس میں جنت کا داخلہ ہوا تھا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس بچی نے اپنی سہیلیاں بنانا شروع کر دیا تھا۔ پہلی کلاس میں پہنچتے پہنچتے تین بچیوں کا گروپ بن چکا تھا۔ ایک تھی"مارلی" (مارلین ولسن،ایک اینگلو انڈین نژاد بچی) دوسری تھی "ماہ نو" (ماہ نو سرفراز) اور تیسری تھی جنت شہاب الدین۔ ان تینوں کے گروپ بن جانے کی وجہ یہ تھی کہ ان تینوں کی رنگت اپنی کلاس میں دوسروں کے مقابلے میں بہت گوری تھی اور ان تینوں کا ذہنی معیار بلند تھا۔ اپنی کلاس میں انکی پرفارمنس ہمیشہ نمایاں رہتی تھی۔ قدرت کو منظور تھا کہ ان کی روداد حیات اگلے پچاس سال تک زینت افسانہ بنی رہے۔

اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے جنت اپنے خاندان میں نمایاں طور پر لاڈلی اور
اپنی دادی اماں کے لاڈوں میں پلی ہوئی بچی تھی۔ دادی اماں کو احساس ہو چکا تھا کہ بچی
بہت ہونہار ہے اور اس پر غیر معمولی نگہبانی لازم تھی۔ ایک بزرگ کی حیثیت سے وہ اپنے
آپ کو تجربہ کار سمجھتی تھیں اور اپنی پوتی کو ہر وقت نصیحتیں کرتی رہتی تھیں۔ امید رکھتی تھیں کہ
انکی پوتی اپنی دادی کی ہر جائز و ناجائز بات مانے گی۔ جنت ایک باغی بچی نہیں تھی۔ وہ
باادب فرمانبردار اور سلجھی ہوئی بچی تھی، لیکن چھوٹی عمر میں ہر بات کی وجہ تسمیہ معلوم کرنا اس
کی روشن دماغی کا ثبوت ہر ذی شعور کو مل رہا تھا۔ بچپن ہی میں اس کی طبیعت میں ولولہ
انگیزی پائی جاتی تھی۔ گرمجوشی کا یہ عالم تھا کہ ہر بام پر کمند ڈالنا چاہتی تھی۔ وہ پتنگ اُڑانا
نہیں چاہتی تھی بلکہ پتنگ میں لٹک کر محلے کی سیر کرنا چاہتی تھی۔ چپکے چپکے ہوا کی خوشامد
کرتی کہ وہ اس کو اُڑا کر لے جائے۔ دلی کی موسمیات کو اس معصوم کی اتنی معصوم دعا پر
رحم آیا۔ ہر موسم نے اسے کچھ نہ کچھ دینا شروع کر دیا۔ چاند کی چاندنی نے اس کے
گورے رنگ کو سرخ و سپید کرنا شروع کر دیا، گرمی کی لو نے اس کے سیاہ بالوں کو چمکایا،
لال آندھیوں نے اس کی آنکھوں کے رنگ کو شربتی کر دیا۔ آبا و اجداد کے خون کی
آمیزش اس بچی کے خون میں کچھ ایسی ابھری کہ اس کے چہرے کے نقوش، چندے ترکمانی
اور چندے ایرانی بن کر ابھرنے لگے۔ اذانوں نے جنت کا قبلہ درست رکھا۔ گھر کے
مرغے نے کبھی اس بچی کو لذتِ خوابِ سحر سے آشنا نہ ہونے دیا۔ بچپنے ہی میں نماز کی پابند
ہو گئی۔ نو سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کیا اور ''آمین'' کی رسم ادا کی گئی۔ وقت
گزرنے کے ساتھ جو واقعات پیش آ رہے تھے ان پر جنت قابو محسوس کر رہی تھی۔ صرف
ایک بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ اس کے کوارٹر کا آنگن دن بدن چھوٹا کیوں ہو رہا تھا۔

جنت کی ''آمین'' کی رسم کو دادی اماں نے ڈگری حاصل کرنے کے مترادف
قرار دیا اور نو سال کی عمر میں دادی اماں کو جنت کی شادی کا مسئلہ لاحق ہو گیا۔ وہ اپنی

لاڈو کو اپنے خاندان میں رکھ کر اس کے بچوں سے کھیلنا چاہتی تھیں۔ کچھ دن تو وہ خاموش رہیں، پھر ایک دن مغرب کی نماز کے بعد اپنے بیٹے شہاب الدین کو اچھے موڈ میں دیکھ کر بولیں:

دادی اماں: ''اے شہاب الدین، اور سنا تم نے، خدیجہ کا لڑکا، ارے وہی تمہاری بیوی کی بہن کا لڑکا۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ واجد علی خاں، آٹھویں جماعت میں اول آیا ہے۔ اتنی سی عمر میں مڈل پاس ہو گیا ہے۔ بڑا ہی ہوشیار لڑکا ہے۔ سمجھے! نہیں سمجھے۔ چراغ لے کر ڈھونڈو گے تو ایسا لڑکا نہیں ملے گا۔ ذرا تم دیکھنا تو سہی، کیا جوانی نکالی ہے۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ اے ہے! ہماری بچی کونسی کم ہے۔ یہ آفت کی پرکالا بھی ہزار میں ایک ہے۔ میں نے لڑکے کی ماں سے جنت کی بات پکی کر دی ہے۔''

شہاب الدین: اماں! ایسی فضول باتیں منہ سے نکالنا اچھا نہیں ہوتا۔ آپ تو بالکل سٹھیا گئی ہیں۔''

دادی اماں: ''اے ہے! سٹھیائیں میرے دشمن۔ ہوش میں بات کہہ رہی ہوں۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ اور شہاب الدین تم بھی ہوش میں آجاؤ، بات پکی ہو گئی ہے۔''

شہاب الدین: ''میں اس بات کو مذاق سمجھ کر ٹالتا ہوں۔ لیکن اگر آپ نے اس قسم کا کوئی قدم اٹھایا ہے تو آپ میرے خاندان کے ساتھ بہت برا کر رہی ہیں۔''

دادی اماں: ''اے لو! سمجھے نہیں سمجھے! میری اولاد مجھ ہی کو برا کہہ رہی ہے۔ شہاب الدین! بیٹی منہ کو آ رہی ہے۔ کیا اسے کنواری رکھو گے؟''

شہاب الدین: ''اماں بی! ہر چیز کا وقت ہوتا ہے۔ ابھی جنت نو سال کی ہے''

دادی اماں: ''آج شادی کون کر رہا ہے۔ جب دل چاہے کرنا۔ سمجھے نہیں سمجھے۔

لیکن ایک بات بتادوں، مرتے مرجاؤں گی، مگر اپنے دیئے ہوئے بول واپس نہ لوں گی۔
مجھ میں بھی غیاث الدین بلبن کا خون ہے۔ سمجھے نہیں سمجھے۔''
دادی اماں کی گفتگو سے معاملہ سنگین معلوم ہونے لگا۔ انہوں نے اپنی اہلیہ کو کمرے میں
بلایا اور دروازہ بند کرلیا۔''سنیئے اماں کیا کہہ رہی ہیں''۔

دادی اماں:''بیٹی میں نے جنت کا رشتہ تمہاری بہن کے بیٹے ہی سے تو کیا ہے۔''

رابعہ بیگم: ''آپ کیا کہہ رہی ہیں، کس کا رشتہ؟''

دادی اماں: ''اے ہے! ایسی بھولی بھی نہ بنو! بیٹی منہ کو آرہی ہے اور تم دونوں کی
آنکھیں پتھرا رہی ہیں۔ بچی کو کنوارا جھل میں رکھو گے۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ اے ہے، میں
اپنی لاڈو جنت کی بات کررہی ہوں۔ سمجھے نہیں سمجھے۔''

شہاب الدین: ''ہاں اماں! ہماری آنکھیں کھلی ہیں۔ وقت پر سب کچھ ہوگا۔
آپ کو اتنی جلدی کیا پڑگئی۔ ماں باپ ابھی.........................''

دادی اماں: ارے ماں باپ ہی کی تو آنکھوں پر پٹیاں بندھ گئی ہیں۔ ہائے میں کیا
کروں؟ سمجھے نہیں سمجھے۔ میں بزرگ ہوں۔ اڑتی چڑیا کو پہچانتی ہوں کہ انڈے کب
دے گی۔ اب میرے چونڈے میں کلپ لگواؤ گی۔ میں نے بول سوچ سمجھ کے دیئے
ہیں۔ اب یہ رشتہ ہوگا ... ضرور ہوگا''۔

شہاب الدین:''اماں! میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ ابھی ان باتوں کے لئے بہت وقت
ہے۔ ہم ان باتوں پر ابھی.................''

دادی اماں: تو ابھی کون کہہ رہا ہے۔ جب دل چاہے شادی کرنا۔ لیکن لڑکا ہاتھ سے
نہیں نکلنا چاہیئے۔ سمجھے نہیں سمجھے''۔

''اماں ہمارا وقت نہ برباد کیجئے'' کہہ کر شہاب الدین اور ان کی اہلیہ کمرے سے باہر جا کر برآمدے میں ٹہلنے لگے۔

شہاب الدین: ''یہ اماں نے کیا شوشہ چھوڑا ہے۔ کہیں اس میں سچائی تو نہیں؟''

رابعہ بیگم: ''میں اپنی ساس کو پہچانتی ہوں۔ ان سے یہ بات بعید نہیں۔ بھان متی کی طرح رشتے جوڑنا ان کی ہابی ہے۔ کئی روز سے وہ آپا خدیجہ کے خاندان کی تعریفوں کے پُل باندھ رہی تھیں''۔

شہاب الدین: ''میں اس معاملہ پر غور کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔ بات کو ٹال دینا''۔

کئی روز تک دادی جان اپنی بہو (جنت کی والدہ) کا برین واش کرتی رہیں۔ انکی منطق یہ تھی کہ لڑکا جانا پہچانا تھا۔ اپنا خون تھا۔ لڑکا پڑھنے میں تیز تھا۔ آٹھویں جماعت میں اپنے سکول میں اول آیا تھا۔ لڑکے کا خاندان بھی اسی حیثیت کا تھا جتنا کہ لڑکی کا۔ لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ چکے تھے اور خوب پہچانتے تھے۔ لڑکے اور لڑکی کا گھریلو ماحول یکساں تھا۔ ازدواجی اونچ نیچ کو سنبھالنے کے لئے لڑکے اور لڑکی کے والدین کے مخلص دوست اور رشتے دار موجود تھے۔ اس رشتے میں کوئی خرابی نہ تھی۔ کچھ دنوں کے بعد ایک وہ وقت آیا کہ لڑکی کے باپ کو اس رشتے میں کوئی خرابی محسوس نہ ہوئی اور پھر ایک وہ وقت آیا کہ جنت کی ماں کو بھی اس رشتے میں کوئی خرابی محسوس نہ ہوئی۔ ایک دن مغرب کی نماز کے بعد باتیں ہو رہی تھیں:

دادی اماں: ''دیکھو رابعہ بیٹی، بول میں نے دے دیئے ہیں نا۔ بس تم دونوں خاموش رہو۔ ڈھنڈورہ نہ پیٹتے پھرو۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ جب مناسب سمجھو شادی کر دینا، لیکن یہ بھی یاد رکھنا، شہاب الدین میں غیاث الدین بلبن کی اولاد ہوں۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ اپنی

بات منوا کر چھوڑوں گی۔''

شہاب الدین: ''اماں! وقت تو آنے دیجئے۔ ہم آپ کی بات سمجھ گئے ہیں۔ لیکن آپ اس بات کا خیال رکھئے گا کہ یہ بات آپ تک ہی رہے۔''

شہاب الدین کی زوجہ محترمہ رابعہ بیگم اور مومن علی خان کی زوجہ محترمہ خدیجہ بیگم آپ میں سگی بہنیں تھیں۔ شہاب الدین اور مومن علی خاں ہم پیشہ تھے۔ Accountant General of Indian Revenue میں دونوں ہم زلف ایک دفتر میں، آفیسر گریڈ میں نوکری کرتے تھے۔ مومن علی خان عمر میں، تعلیم میں، سروس میں، اور عہدے میں شہاب الدین سے سینئر تھے اور اپنی قابلیت کی وجہ سے دفتر میں ان کا سکہ جم چکا تھا۔ وہ نام کے ہی مومن نہیں تھے بلکہ اسم با مسمیٰ زاہد تھے۔ بہت سیدھی سادی طبیعت کے ساتھ دن کو رات کر کے کل کا انتظار کرنا شروع کر دیتے۔ نہ کسی کے لینے اور نہ کسی کے دینے میں۔ اعلیٰ تعلیم اور دفتر میں اپنا خاص مقام حاصل کرنے کے بعد ان کے تین شوق رہ گئے تھے: نوکری، مطالعہ اور مرغیاں پالنا۔ روزانہ شیروانی میں ملبوس وقت سے پہلے دفتر پہنچ جاتے تھے۔ گلے میں گلوبند ان کا ٹریڈ مارک بن کر رہ گیا تھا۔ حالانکہ دفتر میں سب انکو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے مگر ان کا حلیہ دیکھ کر ہر انگریز اور انکا سٹاف آنکھیں چرا لیتا تھا۔ ہر اجنبی ان کو چپراسی ہی سمجھتا۔ یار دوستوں کے کہنے پر بھی انہوں نے اپنے حلیہ میں تبدیلی نہ آنے دی۔ آخر کار اکاؤنٹنٹ جنرل کی طرف سے حکم صادر ہوا کہ تمام افسر صاحبان سوٹ اور ٹائی میں دفتر آیا کریں گے۔ یہ حکم مومن صاحب کو بہت ناگوار گزرا۔ دفتر میں انگریزی زبان میں بول چال اور لکھت پڑھت اپنی جگہ ٹھیک تھی، مگر انگریزی لبادہ پر ٹائی کے پیچ وخم سے روزانہ ہاتھا پائی کے تصور سے تو مومن صاحب کانپ اٹھے۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ پھر خیال آیا کہ حکم حاکم مرگ مفاجات ہوتا ہے۔ نہایت پریشانی کی حالت میں انہوں نے اپنے رفقا کی ہنگامی کانفرنس بلائی اور یہ گھمبیر مسئلہ ان کے سامنے

پیش کیا گیا۔ دوستوں نے ہمت بڑھائی کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں تھی۔ مسئلہ کا حل ایک ہفتہ کے اندر اندر نکل آئے گا۔ ایک دوست نے سوٹ کا کپڑا ملنے کی دکان تجویز کی، دوسرے نے اپنے درزی سے سوٹ سلوانے کی ذمہ داری لی اور تیسرے نے ٹائی باندھنا سکھانے کا وعدہ کیا۔ نہایت شتابی میں محفل نہیں بلکہ ہنگامی ایکشن کمیٹی برخاست ہوئی۔

پانچویں روز ایک عدد سوٹ سل کر زاہد صاحب کے گھر پہنچا دیا گیا۔ لیکن پیچیدہ مسئلہ سوٹ میں گھسنے کا یا سوٹ کو زیب تن کرنے کا نہیں تھا بلکہ سوٹ پر ٹائی باندھنے کا تھا۔ ان کے کان میں ڈالا گیا تھا کہ ٹائی، سوٹ پہننے والا خود باندھتا ہے اور اس انکشاف سے وہ ایسے پیچ پا ہوئے کہ نوکری چھوڑنے کا ارادہ کرنے لگے۔ ''میں ٹائی باندھنے کا کورس کرنے سے بہتر سمجھوں گا کہ اپنی ڈاکٹریٹ کی تھیسس پوری کروں''۔ ان کے عزیز دوست کمال پاشا نے ہمت بڑھائی کہ ٹائی باندھنا اتنا مشکل نہیں، ایک دو روز میں ٹائی کے پیچ و تاب انگلیوں میں ایسے بس جائیں گے کہ مومن صاحب سیکنڈوں میں ٹائی باندھنے لگیں گے۔ بادلِ ناخواستہ مومن صاحب نے اپنے دل کو تسلی دی کہ وہ اپنی زندگی میں شاید اس قابل ہو جائیں کہ خود ٹائی باندھ سکیں۔

دوسرے روز کمال پاشا نے اپنے عزیز اور مومن دوست کو ساتھ لیا اور ایک دکان سے سوٹ کے رنگ پر موزوں ایک خوش رنگ ٹائی خریدوائی۔ ٹائی کو ہاتھ میں لے کر مزید پریشانی مومن صاحب کے چہرے پر عیاں ہوئی۔ سانس پھولنے لگا، ''یہ بندھے گی کیسے؟'' کہتے ہوئے دکان سے نکلے اور صد اضطرابی میں کمال پاشا کو ساتھ لئے اپنے گھر کا رُخ کیا۔ بار بار پوچھتے ''بھائی کمال یہ بندھے گی کیسے؟''۔ جوں جوں گھر کا راستہ کم ہوتا گیا مومن صاحب کا فشار خون بڑھتا گیا۔ گھر میں داخل ہوتے کے ساتھ کمال پاشا سے ٹائی باندھنے کا پہلا سبق لینا شروع کر دیا۔ ٹائی کے اُلٹ پھیر اور موڑ

توڑ کافی پیچیدہ تھے، مومن صاحب کے سر کے اوپر سے گزر گئے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ پٹی نما ریشمی کپڑا، المتخلص بہ ''ٹائی''، ان کے زیبِ گردن نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے التماس کیا ''بھائی کمال، یہ ٹائی اپنے گلے میں باندھ سکتے ہو؟'' ''کیوں نہیں! یہ دیکھئے میں بغیر آئینے کے، یہ ٹائی باندھ کر دکھاتا ہوں اور کچھ ہی سیکنڈوں میں کمال نے اپنے گلے میں ٹائی باندھ کر دکھا دی۔ ''یہ دیکھیے کتنا آسان ہے ٹائی باندھنا''۔ مومن صاحب نے غور سے دیکھا تو انہیں بندھی ہوئی ٹائی اچھی لگی، کہنے لگے ''اس ٹائی کو ڈھیلی کر کے آپ اپنے گلے سے اُتار سکتے ہیں؟'' ''کیوں نہیں'' اور یہ کہہ کر انہوں نے ٹائی کو ڈھیلی کیا اور اُتار کر ٹائی کے مالک کے ہاتھ میں دے دی۔ مومن صاحب ٹائی کی گرہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اسے اُلٹ پھیر کر دیکھا اور پھر کمال سے کہنے لگے'' اس کو ایسے ہی رہنے دو، اس سے میں بہت کام لوں گا''۔

مومن صاحب نے بندھی ہوئی ٹائی سنبھال کر رکھ لی اور دوسرے روز فجر کی نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے اپنی تمام مشکلات کو حل کرنے کی دعا کے بعد انگریزی سوٹ پہنا اور گلے میں کمال کے ہاتھ کی باندھی ہوئی ٹائی کو گلے میں ڈال کر اپنے گلے میں پھندا تنگ کر لیا۔ آئینے میں اپنے آپ کو انگریزی سوٹ میں ملبوس دیکھا تو شرما گئے۔ آواز لگائی ''ارے سُنتی ہو!'' اور اپنی زوجۂ نامدار کو اپنا نیا لباس دکھانے کے لئے اکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ بیگم آئیں اور برجستہ ان کے منہ سے نکلا'' ماشاء اللہ بالکل انگریز لگ رہے ہیں آپ'' پھر غور سے دیکھ کر کہنے لگیں'' شاید ٹائی کالر کے اندر سے باندھی جاتی ہے۔ آپکی ٹائی قمیض کے کالر کے اوپر بندھی ہے، ذرا چیک کر لیجئے''۔ مومن صاحب نے آئینہ دیکھا اور ٹائی کے نیچے سے قمیض کے کالر کے کان کھینچ کر دیکھا، تو ٹائی واقعی زیادہ خوبصورت لگی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ مشکل حل ہوئی۔ کچھ شرماتے ہوئے، کچھ اکڑتے ہوئے مومن صاحب انگریزی لباس میں پہلی بار ڈیوٹی دینے کے لئے دفتر جا حاضر ہوئے۔ دفتر

میں ہلچل مچ گئی۔ کسی نے کالر پیچھے سے ٹھیک کیا، کسی نے ٹائی کو آگے سے فٹ کیا۔
انگریز اعلیٰ افسر دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

دفتر میں دن اچھا گزرا۔ گردن میں اکڑ پیدا ہو گئی۔ مادری زبان میں
انگریزی زبان کے الفاظ کی آمیزش نمایاں طور پر نوٹ کی گئی۔ شام کو جب گھر واپس پہنچے
تو بیگم سے مخاطب ہوئے: ''گڈ ایوننگ! بیگم ایک میز پوش دیجئے'' ''وعلیکم گڈ ایوننگ!
کیا میز پوش بچھا کر سوٹ کے ساتھ میز پر بیٹھیں گے''۔ ''ارے دیجئے تو سہی''۔ بیگم
میز پوش نکال کر لائیں۔ مومن صاحب نے میز پوش کو میز پر بچھایا، کوٹ اتار کر اسکو تہہ کیا
اور میز پوش پر رکھ دیا۔ ٹائی کو گلے سے ڈھیلا کیا اور اس کے پھندے سے اپنے آپ کو
آزاد کیا۔ میز کے پاس کھڑے کھڑے پتلون اتار دی۔ شرم نہ آئی۔ نیچے تو پاجامہ پہن
رکھا تھا۔ پتلون کو تہہ کیا اور کوٹ کے اوپر رکھا۔ اس پر انگریزی قمیض کو تہہ کیا اور
سنبھالکر رکھ دیا اور سب سے اوپر گرہ میں جکڑی ہوئی ٹائی کو احتیاط سے سجایا اور گٹھڑی
باندھ دی۔ دل میں سوچ رہے تھے کہ کل صبح اسی گٹھڑی کو کھول کر پھر دفتر میں حاضری دینی
پڑے گی۔

اس اصول گٹھڑی میں بڑا مایۂ ناز خزانہ بندھا ہوا تھا۔ اس کی بے حرمتی ناقابل
برداشت تھی۔ اس کو محفوظ اور مشترک مقام پر ہی آرام کروایا جا سکتا تھا، لیکن گھر میں ایسی
کوئی الماری نہ تھی جس میں گٹھڑی کو محفوظ کیا جاتا۔ گھر کے در و دیوار کے معائینے کے
بعد دیوار میں ایک چوب لگی ہوئی نظر آئی۔ بیوی بولیں'' آپ اس دیوار گیری پر گٹھڑی کیوں
نہیں ٹانگ دیتے۔ حکومت نے یہ چوب دیوار میں کس دن کے لئے لگائی تھی۔ یہی تو
الگنی کا کام دیتی ہے''۔ ''بے شک بیگم، آپ روشن دماغ ہیں چوب کا استعمال خواتیں
زیادہ بہتر سمجھتی ہیں، لائیے گٹھڑی کو اس پر ٹانگ دیتے ہیں، محفوظ رہے گی''۔ دوسرے
دن چوب پر سے گٹھڑی اتاری گئی، سوٹ جسم پر سجایا گیا اور ٹائی گلے میں ڈال کر اس کا حلقہ

تنگ کیا گیا۔ قمیض کے کالر کے کان ٹائی سے باہر نکالنے کا شعور مومن صاحب کو اب آ چکا تھا۔ آخر تجربہ بھی کوئی چیز ہے، شیشے میں ٹائی ٹھیک کی اور دفتر جا وارد ہوئے۔

اب یہ کھونٹی مومن صاحب کے زہد اور طرز رہائش کا حصہ بن گئی تھی۔ روزانہ اس کھونٹی کو احترام کے ساتھ کھولا جاتا، سوٹ اور ٹائی سے وہی سلوک کیا جاتا جو گزشتہ کل کیا گیا تھا۔ کچھ سال گزرنے کے بعد میز پوش کا کپڑا اس اُدھیڑ بن اور کھتم گتھا میں کافی میلا ہو گیا تھا۔ ایک روز مومن صاحب اپنے سوٹ میں سجے بنے دفتر میں اپنی ڈیوٹی پر تعینات تھے۔ گھر میں کہنہ مشق میز پوش اپنی روزانہ کی سوٹ پر سکیورٹی ڈیوٹی سے تنگ آ کر الگنی پر لٹک کر اکیلا انگڑائیاں لے رہا تھا۔ مومن صاحب کی بیگم قریب سے گزریں۔ میز پوش نے موقعہ دیکھ کر اپنا دامن لہرایا اور خاتونِ خانہ کے چہرے پر ڈال دیا۔ بیگم بولیں ''اُف! کیسی بدبو آ رہی ہے'' میز پوش بولا ''شکریہ کہ کم از کم آپ مخبوط الحواس نہیں ہیں۔ آپ کی سونگھنے کی حس ابھی تک کام کر رہی ہے''۔ ''ارے میز پوش! یہ تم بول رہے ہو؟'' ''آپ کے گھریلو حالات دیکھ کر تو در و دیوار کو قوتِ گویائی ملی ہوئی ہے۔ لیکن گھر کے باسیوں کے کانوں میں ایسا سقل پڑ چکا ہے کہ کوئی کسی کی نہیں سنتا!'' ''ارے میز پوش تمہیں تو عزت ملی ہوئی ہے۔ صاحب کے سوٹ کو آغوش میں لے کر سوتے ہو، اور کیا چاہیئے تمہیں؟'' ''مجھے سونگھ کر تو دیکھو۔ یہ میل کہاں سے آئی؟ تمہارے میاں کا سوٹ دفتر کی تمام میل کچیل مجھ میں چھوڑ جاتا ہے۔ سڑ کر رہ گیا ہوں میں۔ سال سے زیادہ ہو گیا ہے، میلے ہاتھوں نے میرے دست و بازو کو مروڑ مروڑ کر، گرہ میں باندھ باندھ کر مجھے ناکارہ کر دیا ہے تمہارے میاں نے۔ اس ٹائی کی فریاد سنو تو بیہوش ہو جاؤ گی۔ ایک سال کی سنگ سائی نے رسی بنا دیا۔ صبح کو گلے میں پھندا ڈال کر رسی کو ٹائٹ کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ٹائی بندھ گئی۔ شام کو پھندا ڈھیلا کر لیتے ہیں۔ گلے سے رسی اتار کر میرے دامن سے چھپا دیتے ہیں اور اپنے میلے

ہاتھوں کی میل مجھ ہی سے پونچھ لیتے ہیں۔ لو سونگھو مجھے اور سنو۔ اگر ٹائی کی فریاد سنو تو بے ہوش ہو جاؤ گی۔ کہہ رہی تھی کہ میں کبھی ٹوٹل کمپنی کی شاہکار تھی، اس بڈھے نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ رسی بنا دیا۔ ایسی رسی کہ اگر بکری کو اس سے باندھو تو وہ رسی تڑا کر بھاگ نکلے۔ رسی مجھ سے کہہ رہی تھی ''بھائی میز پوش جس دن بھی مجھے موقع ملا اس بڈھے کا گلا گھونٹ کر دم لونگی۔ میری بات یاد رکھنا بھائی اگر یہ کام مجھ نے نہ کیا تو ٹوٹل کا نام مجھ پر حرام ہے۔'' خاتون خانہ نے ابکائی لی اور میز پوش سے دامن چھڑا کر چلی گئیں۔ شام کو مومن صاحب نے گھر پہنچ کر میز پوش مانگا تو ایک نئی شکل کا، نئی تب و تاب لئے ہوئے ایک کپڑا پیش کیا گیا۔ مومن صاحب نے پرانا میز پوش فراہم کرنے کی فرمائش کی تو جواب ملا'' میلا ہو گیا تھا اور آپ کی ٹائی کو بھی میلا کر رہا تھا، دھوبی کو دے دیا۔ اور وہ رسی نما ٹائی بھی میز پوش کے ساتھ دھوبی کو دھلنے کے لئے دیدی ہے، میل اُتر جائے گی۔''

مومن صاحب کی دنیا کا محور دفتر تھا۔ سرکاری کام میں اپنے کام کے جوہر دکھانے کے وہ ماہر تھے۔ لیکن ان کی گھریلو زندگی ناقابلِ یقین حد تک سادہ تھی۔ غسل خانے میں ایک لوٹے اور غسل کے ایک پٹڑے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ٹوٹی میں کپڑا بندھا رہتا تھا تا کہ پانی کی چھینٹیں کپڑوں پر نہ پڑیں۔ اگر کوئی مہمان آتا تو اس ترکیب استعمالِ غسل خانہ بتائی جاتی کہ اگر چھینٹیں کپڑے کے بندھے ہوئے ہونے کے باوجود پڑیں تو پٹڑے کو عمودی طور پر پیروں کے سامنے کھڑا کر لیا جائے۔ چھینٹیں نہیں پڑیں گی۔ یہ تکنیک ایک ٹکنیکل ارتقاء سمجھی جاتی تھی۔ اس گھریلو ماحول میں مومن صاحب کا گھرانہ جس میں اُنکی زوجہ محترمہ خدیجہ بیگم اور ان کا بیٹا واجد علی (جنٹ بی بی کا خفیہ منگیتر) باعزت زندگی گزار رہے تھے۔ ان افراد کی سادگی کا عالم یہ تھا کہ قطب الدین ایبک کے زمانے کی پبلک لائف یاد آجاتی تھی۔ صحن کے کونے میں مُرغیوں کا دڑبہ تھا جس میں ایک مرغا اپنی چار منکوحہ بیویوں کے ساتھ دندناتا پھرتا تھا۔ اس نے بھی پانچویں نکاح کا

ارادہ نہ کیا کیونکہ مسلمان تھا۔ موذن کا پیشہ کرتا تھا۔ کبھی اس نے اذان کے اوقات میں غلطی نہ کی۔ ہمیشہ تہجد اور فجر کے درمیانی اوقات میں اذان دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کچھ لوگ تہجد دیر سے پڑھتے ہیں اور کچھ لوگ فجر جلدی۔ جلدی اس واسطے پڑھتے ہیں کہ دفتر وقت پر پہنچ جائیں۔ ایک پبلک سرونٹ ہونے کے ناطے سے اس نے اپنے اوقات میں استقلال رکھا ہوا تھا۔ یاں الصبح مرغا اپنا ایک بازو زمین پر رگڑ رگڑ کر اور ایک ٹانگ پر اچھل اچھل کر اپنی بیویوں کی طرف ضرور جاتا اور اپنی وفاداری کا یقین دلاتا اور حق زوجیت ادا کرنے کی نیت کا اظہار کرتا رہتا تھا۔

مرغیوں کے دڑبے کے برابر چار پائیاں کھڑی رہتی تھیں۔ دن کو کھڑی حالت میں اور رات کو پڑی حالت میں استعمال میں لائی جاتی تھیں۔ مومن صاحب دفتر جانے سے پہلے چار پائیوں کو ضرور چیک کرتے کہ کہیں کوئی چار پائی اُلٹی تو نہیں کھڑی ہوئی۔ انہیں یقین تھا کہ جس روز چار پائی اُلٹی کھڑی کر دی گئی تو وہ دفتر سے زندہ واپس نہ آئیں گے۔ موسم سرما میں چار پائیوں سے ایک خدمت بیگم مومن لیا کرتی تھیں۔ تین چار پائیوں کو لمبے رُخ کھڑا کر کے اس پر چادریں ڈال لیتیں اور ان کے درمیان دھوپ میں بیٹھ کر غسلِ واجب کر لیا کرتی تھیں۔ اکثر چوتھی طرف سے مُرغا ٹہلتا ٹہلتا آ جاتا، یہ چیک کرنے کے لئے کہ غسلِ واجب کے تمام رکن ادا کئے جا رہے ہیں یا نہیں۔ بیگم خاموشی سے اپنا کام کئے جاتیں کہ اس مُرغے سے کیا پردہ، وہ تو موذن تھا، مسلمان تھا، پبلک سرونٹ تھا۔ کبھی ڈرتی بھی تھیں کہ کہیں چونچ نہ مار دے۔ ایک دن مرغا ایک ٹانگ پر کودتا ہوا اور اپنے پیر کو زمین پر رگڑ کر بیگم کی طرف آتا دیکھا گیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کا صابن کھینچ کر مرغے کو مار کر کہا ''حرامی، مُردار، دفع ہو یہاں سے''۔

صحن پکی اینٹوں اور سیمنٹ سے بنایا گیا تھا، اس کو صاف رکھا جا سکتا تھا، مگر لعنت ہو اس مرغے پر اور اس کی چار بیویوں پر کہ جگہ جگہ اپنا پیٹ خراب ہونے کے

نشانات چھوڑ رکھے تھے۔ صحن میں شاید ہی کوئی جگہ بچی ہو جہاں مرغیوں نے اپنے مسلمان ہونے کو ثبوت سبز اور سفید بیٹ سے نہ دیا ہو۔ صحن میں نمکین بدبو اور سوندھی سوندھی خوشبو کی آمیزش سے صحن میں بڑا گھریلو ماحول بنا رہتا تھا۔ ایک دفعہ جنت اپنی ماں کے ساتھ مومن صاحب کے ہاں ملنے گئی تو اس کو صحن کی بدبو ناقابلِ برداشت حد تک ناگوار گزری۔ اس کے منہ سے برجستہ نکلا:

جنت: ''خالہ جان آپ صحن کیوں نہیں دھوتیں، مجھے اُبکائی آ رہی ہے، کیسی خراب بو ہے۔''

خالہ جان: ''اس صحن کا دھونا آسان ہے؟ کون دھوئے گا اتنے بڑے صحن کو، تم آ کر دھو جاؤ۔ لے آؤ اپنے اماں ابا کو، سب مل کر دھولیں گے۔''

جنت: ''یہ مُرغیاں اتنی گندی کیوں ہوتی ہیں، اور جگہ جگہ گندگی کیوں پھیلاتی ہیں۔''

خالہ جان تڑک کر بولیں: ''اے ہے جنت! کھاتی پیتی مُرغیاں ہیں، کوئی فاقے تھوڑی مر رہی ہیں۔ کھائیں گی تو نکالیں گی بھی، اب میں ڈاٹ تو لگا نہیں سکتی۔''

جنت: ''خالہ جان یہ صحن ہر ہفتے دھلنا چاہیے۔ طبیعتیں خراب ہو جائیں گی۔''

خالہ جان: ''نازک لہرا! آ جاؤ اماں ابا کو ساتھ لے کر، دھو جاؤ اس گندگی کو۔ میرے بس کا روگ نہیں ہے اس صحن کا دھونا۔''

بات گئی گزری ہوئی مگر جنت کے نازک مزاج کو مومن صاحب کے صحن کی تعفن یاد کر کر کے ابکائی آتی رہی۔ اس نے اپنی اماں سے اصرار بھی کیا کہ سب لوگ جمع ہو کر مومن صاحب کے گھر کا صحن دھو آئیں۔ اور آخرکار ایک دن جنت اپنی ماں سے لپٹ کر بولی، ''اماں تین دن کی چھٹیاں آ رہی ہیں۔ چلیے سب مل کر خالہ جان کا صحن دھوتے ہیں۔ واقعی خالہ جان کو احساس نہیں کہ وہ کتنا گندہ ہے، انکو مدد کی ضرورت ہے۔''

شہاب الدین کو بھی صحن کی گندگی کا احساس تھا اور چھٹیوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انہوں نے مومن صاحب کے گھر کا صحن دھونے کا پروگرام بنایا۔ پروگرام ایسے بنا

کہ جنت اپنی خالہ کے گھر اپنے والدین اور دادی جان کے ساتھ جا کر دو دن اور دو راتیں گزاریں گے۔ دوسرے دن صحن کی صفائی ہوگی۔ رات کو داستانِ امیر حمزہ دادی اماں سنائیں گی۔ تیاریاں شروع ہوگئیں۔ قیمہ بھرے پراٹھے لے کر شہاب الدین کا خاندان دوپہر کے کھانے سے پہلے مومن صاحب کے ہاں پہنچ گیا۔ دونوں بہنوں کا خاندان بہت دنوں بعد جمع ہوا تھا۔ کسی کو سمجھ نہ آتا تھا کہ کس بات پر نہ ہنسیں۔ دلی خلوص کے ساتھ اور محبتوں سے سرشار فضا سے گھر مہک اٹھا۔ دادی اماں سب پر ''اے میں واری جاؤں'' ہو رہی تھیں۔ جنت کی دوسراہٹ کے لئے ہمسائے سے جنت کی دوست ماہ نور کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ واجد میاں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ماہ نور کے بھائی رضوان کو بھی بلوا لیا کہ وہ بھی اپنی بہن کے ساتھ کھانے پر آجائے اور صحن دھونے میں مدد کرے۔

خوش گپیوں میں وقت ایسا گزرا کہ تھوڑی دیر میں رات ہوگئی۔ جون کا مہینہ اور چاند کی پندرہ تاریخ، شام ڈھلتے کے ساتھ ہی سب صحن میں نکل پڑے۔ بان کی چارپائیاں بچھائی گئیں، ان پر پانی چھڑکا گیا اور دادی اماں نے داستانِ امیر حمزہ کی نوٹنکی جمانے کے لئے چارپائیوں کو آگے پیچھے کرنا شروع کیا۔ اپنے گاؤ تکیے کو دوسری چارپائی پر لے گئیں اور اس پر اپنی چھالیہ کا کُترا سجا لیا۔ پھر سروتا بجا بجا کر آواز لگائی: ''چلو بچوں، چلو بالیوں، کہانی لمبی ہے۔ غور سے سُننا۔ سونا نہیں گناہ ہوگا۔ بس آجاؤ کہانی شروع ہوتی ہے۔'' اور پھر سروتا بجانا شروع کیا۔ شہاب الدین بے تاب ہو کر بولے: ''اماں سروتا تو نہ بجایئے، کیا لڑائی کروائیں گی۔ بس سب خاموش، خبردار کوئی بولا! غور سے سب سنیں گے! ہاں اماں اب شروع کریں۔'' ''بچوں تمہیں یاد ہے نا کہ عمر ایار نے چلتے چلتے پورا دریا اپنی زنبیل میں ڈال لیا تھا۔ میں اس کے آگے سے شروع کرتی ہوں۔'' جنت بولی: ''دادی اماں بور نہ کیجئے وہ تو بہت لمبا قصہ ہے صبح ہو جائے گی۔''

واجد: ''اور مرغا اذان دے دے گا، پھر کون سو سکے گا۔''

دادی اماں: ''اچھا چلو وہیں سے شروع کرتی ہوں جب طوطا شہزادی کے سر پر آ کر بیٹھا تھا''

جنت: ''وہ بھی یاد ہے اس کے سر پر کیل چبھی ہوئی تھی''

دادا اماں: ''خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ شہزادی نے طوطے کے سر سے کیل نکالی تو طوطا شہزادہ بن گیا''

مرغا: ''ککڑوں کوں''

دادی اماں: ''نامراد مرغے! طوطے کے سر سے کیل نکالی تھی، تو کیوں بیتاب ہو گیا؟''

بیگم مومن: ''اماں، مجلس برخاست سمجھئے اس مرغے کی گھڑی میں خلل آ چکا ہے۔ اب ہر دس منٹ پر اذان دیئے جائے گا۔ سونا حرام کر دیگا۔''

شہاب الدین: ''مومن بھائی اس مرغے پر کوئی سائلنسر فِلس نہیں ہو سکتا؟''

رضوان: ''ایک دفعہ پہلے بھی اس کی گھڑی خراب ہوئی تھی۔ ہمارے امتحان ہونے والے تھے، اس نے پڑھنا دشوار کر دیا تھا۔ میں نے چپکے سے آ کر اس کی چونچ پر ڈوری باندھ دی تھی۔ اس نے سر پٹخ پٹخ کر اپنے آپ کو زخمی کر لیا تھا لیکن چپ ہو کر نہ دیا''

مومن صاحب: ''اچھا تو یہ آپ کی حرکت تھی۔ رضوان میاں! آج یہ عقدہ کھلا''

بیگم مومن: ''سامعین میں آپ کو مطلع کرتی ہوں کہ اس مرغے کی بانگ کے صدقے آج سونا حرام سمجھئے''

دادی اماں کی تو نشست برخاست ہوئی۔ سب نے مرغے سے زیادہ سے زیادہ دور جا کر اپنا بستر لگانا شروع کیا اور کانوں میں روئی ٹھونس کر سونے کی کوشش کی۔

مرغے کی اذان کی گونج میں دوسرا دن شروع ہوا۔ آج گھمسان کا رن پڑنے والا تھا۔ آج صحن کی صفائی اور دھلائی ہونی قرار پائی جا چکی تھی۔

قصہ صحن کا

انسان منہ دھو لے، جسم دھو لے، کپڑے دھو لے، چلو برتن دھو لے لیکن یہ صحن دھونے کی کیا تک تھی اور وہ بھی پیکرِ زہد، مومن علی خان کا صحن جسے معصوم مرغیوں نے پاک یا ناپاک کر رکھا ہو۔ صحن دھونے سے آسان اور بہتر تھا کہ جوئے شیر نکال لی جاتی۔

مومن صاحب کو یہ مسئلہ ناگوار حد تک پیچیدا اور ناقابلِ تسخیر لگ رہا تھا۔ ابھی سب لوگ مرغے کی اذانیں سن سن کر خوابِ پریشاں سے اٹھے ہی تھے کہ انہوں نے نہایت منکسر مزاجی سے اس گمبھیر ہنگامے سے سبکدوش ہونے کا اعلان کیا اور انہوں نے تمام تر ذمہ داری اپنے ہم زلف پر ڈال کر محترم شہاب الدین صاحب کو پروجیکٹ منیجر ہونے پر مبارکباد دیدی۔ شہاب الدین کو تو پہلے ہی سے احساس تھا کہ کام تو ان ہی کو کرنا پڑے گا کیونکہ صحن دھونے کی ضد ان کی بیٹی نے کی تھی۔ چنانچہ وہ پہلے ہی سے اپنے ساتھ ربڑ کی ٹیوب اور جھاڑو لے کر آئے تھے۔

ابھی ناشتہ ہو ہی رہا تھا کہ شہاب الدین نے درپیش معرکہ کی ڈیوٹیاں بانٹنا

ضروری سمجھا کہ کسی کو کسی قسم کا شک نہ رہ جائے اور سب اپنی اپنی ذمہ داریوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برا ہوسکیں۔ ذمہ داریاں کچھ ایسے دی گئیں تھیں:

شہاب الدین: چیف پروجیکٹ مینیجر اور ہیڈکوارٹر انچارج۔

واجد علیخان خلف مومن علی خان: کل پرٹوٹی کنٹرولر۔

رضوان خان: (ہمسایہ واجد علی خان) جھاڑو مار نمبر ایک۔

جنت: جھاڑو مار نمبر دو۔

ماہ نور (مومن علیخان کے ہمسائے کی بیٹی اور رضوان کی بہن): جھاڑو مار نمبر تین۔

خدیجہ بیگم (بیگم مومن خان): چارپائی اور سامان بچاؤ

رابعہ خاتون (بیگم شہاب الدین): انچارج مرغی جات۔

مومن علی خان (اہلِ خانہ): سارنگی نواز، ریڈیو انچارج۔

چونکہ معاملہ سنگین تھا اور معرکے میں گھمسان کا رن پڑنے کا امکان تھا اس لئے سب کو ان کی ڈیوٹیاں کیچڑ کی طرح شفاف کر کے سمجھا دی گئیں۔ چیف پروجیکٹ مینیجر نے اعلان کیا کہ معرکہ ٹھیک دس بجے شروع ہوگا۔ رضوان خان نے اپنی گھڑی کو سنکرونائز کر لیا۔ عین دس بجے نعرہ لگایا گیا "Take Post"۔ سب اِدھر اُدھر بھاگے۔ شہاب الدین نے ربڑ کی ٹیوب صحن میں پھیلائی، جھاڑو ماروں نے زمین پر جھاڑو مار کر یقین دلایا کہ وہ اپنی ڈیوٹی پر تعینات ہو چکے ہیں۔ رابعہ خاتون نے آواز لگائی ''ڈڑبے، ڈڑبے'' اور مرغیوں کو انکے بیڈ روم کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ مرغے نے اعلان کیا ''ککڑوں کوں'' جس کا مطلب تھا کہ اس کا دن کے دس بجے اپنی چار بیویوں کے ساتھ بیڈ روم میں جانا باعثِ شرم تھا۔ رابعہ بیگم نے ڈنڈا اٹھایا اور مرغیوں کو ان کے ڈڑبے کی طرف ہانکنا شروع کر دیا۔ مرغا اس دخل در معقولات کے احتجاج میں اُڑ کر کوارٹر کی دیوار پر جا بیٹھا اور کوں، کڑک کوں کر کے اپنی بیویوں کو اپنی زبان میں ہدایات دیتا رہا۔ رابعہ ڈنڈا لے

کر اس کی طرف بڑھیں۔ مرغا اس قسم کے برتاؤ کا عادی نہ تھا، وہ سڑک پر دوسری طرف کود گیا۔ مومن علیخان بولے'' کیا غضب کر رہے ہیں آپ لوگ؟ میرے صف شکن کو گھر سے نکال دیا؟ جلدی اندر لائیے'' مرغیوں نے بھی اپنے شوہر نامدار کی پیروی کرنی چاہی اور چار سمتوں میں چار مرغیوں نے پھڑ پھڑا کر اڑنا شروع کیا مگر دیوار انکی قوت پرواز کے لئے زیادہ اونچی تھی۔ یکے بعد دیگرے کسی نہ کسی کے ہاتھوں پکڑی گئیں اور داخلِ دڑبہ کر دی گئیں۔ مومن علی خاں کے صبر کا پیانہ لبریز ہو چکا تھا وہ بے قرار ہو کر ''میرا مرغا، میرا اصیل مرغا'' کہتے ہوئے سڑک پر بے تاب نکلے اور کبھی شمال کی طرف مرغے کی تلاش میں نکلے اور کبھی جنوب کی طرف دوڑے، مگر مرغا تو غائب ہو چکا تھا۔ وہ نہایت پریشان حالی میں گھر واپس لوٹ آئے'' ارے چھوڑیئے صحن دھو کر کیا کریں گے، مرغا ڈھونڈیئے''۔

رضوان: '' انکل پورا محلہ مرغے کی اذان سے آشنا ہے، وہ چھپایا نہیں جا سکتا۔ بہت چالاک چیز ہے گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ مرغا اپنی چار بیویوں کو نہیں چھوڑے گا، اپنے آپ آ جائے گا''

مومن علی: '' بھئی میں باہر رہتا ہوں، آپ صحن دھوئیے، لیکن آپ لوگوں نے میرے مرغے کے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔ اللہ کرے مل جائے میرا صف شکن''

شہاب الدین: ''بس، آرڈر آرڈر، ہنسنا بند۔ ٹونٹی کنٹرول، ٹیوب نل کے ساتھ جوڑ دی جائے''۔ سب خوش ہوئے کہ چلو کام تو شروع ہوا۔ جھاڑو ماروں نے زمین پر جھاڑو مار کر ثبوت دیا کہ وہ ڈیوٹی پر حاضر تھے۔ کوئی پانچ منٹ ہو گئے لیکن ٹیوب خشک کی خشک۔ چھڑکاؤ کا انچارج اور چیف پروجیکٹ منیجر نے ٹیوب کے منہ کو احتیاط سے دیکھا۔ ڈر رہے تھے کہ کہیں پانی کی دھار انکے منہ پر نہ آئے۔ ٹیوب خشک تھی۔ انہوں نے ٹیوب کو جھٹکا دیا، ٹیوب خشک رہی۔ وہ پانی کے انتظار میں آرام سے کھڑے

رہے کہ پانی آئے گا تو زمین پر گرے گا اور پتہ چل جائے گا۔ سب کارکنوں پر سکتہ طاری تھا۔ پانی آئے تو جھاڑو چلائیں۔ دس منٹ گزر گئے... ٹیوب خشک کی خشک۔ چھڑکاؤ انچارج نے ٹیوب کو آنکھوں کے پاس لا کر احتیاط سے دیکھا۔ ٹیوب خشک۔ وہ ٹیوب کو منہ کے پاس لائے اور پھونک ماری۔ ٹیوب میں سے سرگم کے "پا" کا سُر نکلا۔

"لاحول ولاقوۃ" شاید ٹیوب میں کہیں اسٹوپیج ہے۔ میاں رضوان ذرا ٹیوب کو چیک کرنا۔ یہاں سے چیک کرتے ہوئے جاؤ اور آخیر سرے تک چیک کرو کہ کیا ماجرہ ہے۔

رضوان ٹیوب کو انگلیوں سے دباتے ہوئے نل کی طرف روانہ ہوئے۔ غسل خانے کے اندر پہنچے۔ وہاں تک ٹیوب بالکل ٹھیک تھی، لیکن ان کے دوست واجد علی خان پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ نہایت بے تابی سے ہاتھ پیر مار رہے تھے۔ دوسرا سرا ان کے ہاتھ میں تھا۔

رضوان: "واجد ٹیوب نل میں فِکس کرو نا، سب انتظار کر رہے ہیں"۔

واجد: "یار نل میں تو کپڑا بندھا ہوا ہے۔ کپڑے کے ساتھ ٹیوب ٹونٹی پر چڑھ نہیں رہی، کیا کروں؟"

دوسرے سرے پر شہاب الدین کبھی ٹیوب کو آنکھوں سے لگا کر اس میں جھانکتے اور کبھی منہ کے پاس لا کر اس کو مائکروفون بنا کر فرمائش کرتے "آجا.. آجا پانی"۔ دوسرے سرے پر واجد نے ٹیوب میں سے آواز سُنی "یار ٹیوب میں گڑبڑ ہے، آواز آرہی ہے"۔

رضوان: "تم چھوڑو، لاؤ میں ٹیوب کو ٹونٹی میں فِکس کرتا ہوں" اور یہ کہہ کر رضوان نے کپڑا ہٹا کر ٹیوب کو اچھی طرح ٹونٹی پر چڑھا کر پورا نل کھول دیا۔ شہاب الدین نے پھر ٹیوب کو جھٹکا دیا۔ اس کو مائکروفون بنایا "ہیلو پانی... ہیلو، ہیلو، پانی کہاں ہو؟" اور یہ سوال کر کے اس کے جواب کے انتظار میں ٹیوب کو اپنے کان میں لگا لیا۔ پانی نے پوری طاقت سے شہاب الدین کے کان میں پھنکار ماری۔ انھیں ایسا لگا کہ پانی کی دھار ان

کے دوسرے کان سے باہر نکل گئی ہو۔ انہوں نے ٹیوب کو آسمان کی طرف پھینکا اور صحن کے دوسرے کونے میں جا کر گرے۔ انکی بیوی گھبرا کر بولیں "بسم اللہ، بسم اللہ، اے ہے اللہ خیر کرے، آپ ٹھیک تو ہیں نا"۔ ایک منٹ کے بعد شہاب الدین بولے: "کیا ہوا؟ تم لوگ میری آواز سُن سکتے ہو، مجھے کچھ سُنائی نہیں دے رہا۔ بیگم تولیہ دینا، میرے تو سارے کپڑے گیلے ہو گئے"۔ جھاڑو ماروں نے اپنی اپنی جھاڑو زمین پر پھینکی اور ہنستے ہوئے برآمدے میں چلے گئے۔ باہر سے مومن علی خان پریشان حال اندر آئے اور کہنے لگے "میں آپ سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ کسی قسم کا حادثہ پیش آ سکتا ہے، صفائی چھوڑیے، آیئے مرغا ڈھونڈتے ہیں"۔ کوئی آدھ گھنٹے میں شہاب الدین نے سنبھالا لیا۔ جھاڑو ماروں کو اپنی اپنی جگہ پر کھڑا کیا اور پانی کی دھار صحن کے فرش پر ڈالنی شروع کی۔ آخرِکار صفائی شروع ہو گئی۔ پانی کی دھار کافی تیز تھی۔ پروجیکٹ مینیجر نے اپنے لائق اسٹاف کے ساتھ صحن میں سے مرغیات کی تمام گندگی دھو کر سانس لیا۔ جب ایک گھنٹے تک پانی کی تیز دھار پڑتی رہی تو کافی پانی جمع ہو گیا تھا۔ پورے صحن میں کوئی چھ انچ پانی کھڑا ہو گیا۔ اب شہاب الدین صاحب کو احساس ہوا کہ صحن میں پانی کے نکاس کا کوئی سسٹم نہ تھا۔ دروازہ جو باہر سڑک پر کھلتا تھا اس کی چوکھٹ اونچی تھی اور پانی کو روکے ہوئے تھی۔ صحن پانی کا تالاب بن چکا تھا۔ اب معاملہ حقیقتاً پیچیدہ تھا۔

مومن علی خاں: "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ صحن دھونے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی۔ یہ کس کا آئیڈیا تھا۔ مرغا بے گھر ہوا۔ اللہ اس کو اپنے حفظ و امان میں رکھے"۔

دادی اماں: "ارے میں کہتی ہوں پانی کو پتیلیوں میں بھر بھر کر باہر پھینک دو، سمجھے نہیں سمجھے۔"

خدیجہ بیگم: "اے نوج میں اپنی پتیلیاں دوں۔ پانی پر آپ دیکھ رہی ہیں کہ مرغیوں کی کیا گندگی تیر رہی ہے۔"

واجد علی: ''ایسا ہی رہنے دیں، ایک دو روز میں پانی آپ سوکھ جائے گا۔''

جنت: ''اس پانی کی بدبو سے تو اب کوے بھی دور بھاگ رہے ہیں''

رضوان: ''اس پانی کو سائفن کیا جا سکتا ہے۔''

مومن علی: ''وہ کیا ہوتا ہے۔''

رضوان: ''باہر سڑک کے پار زمین کا لیول بہت نیچا ہے۔ اصولاً سائفن آسان ہوگا اور کشش کی ضرورت نہ پڑے گی۔''

شہاب الدین: ''پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟ پانی چوکھٹ کو کیسے عبور کرے گا''

رضوان: ''سائفن سے ہو جائے گا''

مومن علی: ''میاں کیا جادو کرو گے کہ پانی اپنے آپ چوکھٹ کو کراس کر جائے گا۔''

رضوان: ''یہ ٹیوب کافی لمبی ہے۔ میں سائفن کروں گا۔ جیسے میں کہوں آپ لوگ کرتے جایئے، سائفن ہو جائے گا اور پانی نکل جائے گا۔''

رضوان نے ٹیوب کے دونوں سرے صحن میں اکٹھے کئے اور ایک سرے سے لوٹے سے پانی بھرتا کہ ٹیوب کی ساری ہوا نکل جائے۔ جنت سے کہا کہ وہ ٹیوب کا ایک سرا ہاتھ سے پکڑ کر اوپر رکھے۔ رضوان جب دوسرا سرا دروازے سے باہر لے کر جائے اور سڑک پار نیچی زمین پر ڈال دے تو جنت ٹیوب کو صحن کے کھڑے پانی میں ڈال دے۔ پانی گھر سے باہر جانا شروع ہو جائے گا۔ یہ کام جنت کے واسطے مشکل نہ تھا، لیکن نا قابلِ یقین ضرور تھا۔

رضوان: ''جنت تم یہ کام کر سکتی ہو نا؟ دیکھو جب میں کہوں تب ڈالنا، پہلے نہ ڈال دینا۔ اگر پہلے ڈال دیا تو کام نہیں ہوگا، سمجھ گئیں نا۔ اچھا میں ایک سرا باہر لے کر جاتا ہوں۔ تم تیار ہونا؟ میں جب وہاں سے آواز لگاؤں تب پانی میں ٹیوب ڈالنا''۔

جنت: ''ہاں ہاں میں اس سرے کو اوپر پکڑے رکھوں گی اور جب آپ کہیں گے تو اس سرے کو پانی میں ڈبو دوں گی۔ بس اتنا کام ہے نا؟''

رضوان: ''ہاں، شاباش تیار ہو؟ اب میں سڑک پار جاتا ہوں''
یہ کہہ کر رضوان ٹیوب کے سرے کو اوپر کئے کئے بھاگے باہر گئے اور نیچے لیول پر جا کر آواز لگائی ''ڈالدو''۔ جنت نے ٹیوب کا سرا صحن کے کھڑے پانی میں ڈال دیا۔ سب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ خاموشی! رضوان کی آنکھیں ٹیوب کے سرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پانی نے ایک دو جھٹکے لئے اور ٹیوب کے سرے سے تیزی سے پانی نکلنا شروع ہو گیا۔ رضوان بھاگے بھاگے اندر آئے۔
رضوان: ''سائفن شروع ہو گئی ہے۔ صحن کے اندر والی ٹیوب کا سرا پانی سے نہ نکلنے پائے ورنہ سارا جادو ختم''۔
مومن علی خاں: ''میاں رضوان کیوں سب کو پریشان کر رکھا ہے۔ کبھی ایسے بھی پانی صحن کی اونچی چوکھٹ کو پار کر سکتا ہے؟ اس کھیل سے بہتر ہے مرغا ڈھونڈیں''۔
رضوان: ''انکل پانی تو نکل رہا ہے، آیئے دیکھئے''۔
سب حاضرین اور کارکنان صفائی صحن میں کھڑے پانی میں چھپ چھپ کرتے گھر کے باہر بیتابی سے آئے کہ رضوان میاں کا کرتب دیکھیں۔ دادی اماں یہ معجزہ دیکھے بغیر کیسے رہ سکتی تھیں وہ بھی اپنا غرارہ سنبھال کر صحن کے کھڑے پانی میں کود گئیں اور غرارے کو پانی پر تیرتے ہوئے باہر نکل آئیں۔ ''اے ہے میں بھی تو دیکھوں کہ پانی چوکھٹ پر سے کیسے کودا''۔ سب نے ٹیوب کا معائنہ کیا۔ پانی تو تیزی سے نکل رہا تھا۔
شہاب الدین: ''کمال ہے! میاں رضوان یہ کام کہاں سے سیکھا؟''
واجد علی: ''انکل یہ سائنس پڑھ رہا ہے، اس میں سیکھا ہوگا۔''
جنت: ''کمال تو میرا ہے کہ میں نے پانی کو دھکیلا۔''
سب پانی کو پوری رفتار سے نکلتا دیکھ کر امید لگائے دیکھ رہے تھے کہ پانی بند ہو جائے گا، لیکن پانی تو مستقل نکلتا رہا۔

خدیجہ بیگم: ''پھٹکار پڑے اس انگریز پر! کیسے کوارٹر بنوائے ہیں کہ صحن سے موری نہیں نکالی۔ ہر بارش میں یہ مصیبت آتی ہے۔

دادی اماں: ''اے خدیجہ بیگم ذرا دیکھو تو وہ کیا ہے؟ دیوار میں سے موری تو نکلی ہوئی ہے۔ وہ دیکھو، کسی نے اینٹ پھنسا رکھی ہے۔''

سب نے دیوار کی طرف دیکھا۔ دیوار میں موری ہنس رہی تھی۔ اس میں اینٹ پھنسی ایسی لگ رہی تھی جیسے دادی اماں کے منہ میں پان کی گلوری پھنسی ہوئی ہو اور وہ حالاتِ حاضرہ پر مسکرانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ رضوان نے اندر سے موری کو جا کر دیکھا۔

رضوان: ''انکل موری کے آگے مرغیوں کا دڑبہ بنا ہوا ہے۔''

مومن علی: ''اف فو! اب یاد آیا، دڑبہ بنواتے وقت میں نے موری میں اینٹ پھنسوائی تھی۔ بھئی کیا کرتا؟ چوہے دڑبے میں گھس آتے! مرغیاں پال کر تو اب تو کماتا تھا''۔

سب لوگ اندر آئے۔ صحن میں کوئی پانچ انچ پانی کھڑا تھا۔ پانی پر جگہ جگہ پیٹ کی خرابی کے ثبوت تیرتے نظر آ رہے تھے۔ شہاب الدین کے کپڑے پانی میں شرابور ہو رہے تھے۔ رضوان اور واجد علی نے اپنے پاجامے کے پائنچے اوپر لپیٹے ہوئے تھے لیکن دونوں کی قمیصیں پانی میں گیلی ہو چکی تھی۔ جنت نے اپنی شلوار کے پائنچے اوپر کر رکھے تھے اور اس کی قمیض گیلی تھی۔ دادی اماں کے غرارے کا گھیر پانی میں شرابور تھا۔ مومن علی چونکہ ابھی تک سارنگی نواز کی ڈیوٹیاں دے رہے تھے اس لئے انکے کپڑے خشک تھے مگر انکا پاجامہ شرعی سرحدوں سے کہیں زیادہ اوپر آ چکا تھا اور انکی پنڈلیاں پانی میں گیلی تھیں۔ خاتونِ خانہ خدیجہ بیگم اور جنت کی والدہ کی شلوار گھٹنوں تک گیلی ہو چکی تھی۔ اب سب کا رُخ مرغیوں کے دڑبے کی طرف ہوا۔ سب دانت پیس رہے تھے کہ کسی طرح موری کھلے اور غلاظت سے نجات حاصل ہو۔ رضوان آگے بڑھے اور مرغیوں کے دڑبے کا دروازہ کھولا۔ مرغیاں پہلے ہی کھڑے کھڑے پانی میں اپنے پر گیلے کر چکی تھیں، نکلنے کو

بتاب تھیں۔ پھر پھڑا کر باہر نکلیں اور پانی کے تالاب پر مرغابیوں کی طرح ٹیک آف کرنے کی کوشش کی۔ جب قوتِ پرواز نے جواب دیا تو خشک جگہ پر لینڈ کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ خشک جگہ، صرف انسانوں کے سر رہ گئے تھے۔ صاحب خانہ مومن علی پانی کے تالاب میں ایسے تلملا رہے تھے جیسے گرم کڑھائی میں پکوڑا تلا جا رہا ہو۔ بے تاب ہو کر نعرہ لگایا: ''کیا غضب کر رہے ہیں آپ لوگ! مرغیاں انڈوں پر ہیں۔ اللہ رحم کر۔ وہ شاید پہلے ہی بیوہ ہو چکی ہیں۔ ہائے میرا مرغا''۔

سب گیلی مرغیاں چاروں طرف پھڑ پھڑاتی ہوئیں خاندان کے تمام افراد کے چہروں پر پانی کا چھڑکاؤ کرتی ہوئیں اِدھر اُدھر اُڑ رہی تھیں۔ ایک مرغی پھڑ پھڑاتی ہوئی آئی اور دادی اماں کے سر پر بیٹھ کر پیر ٹکانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بیلنس برقرار نہ رکھ سکیں۔ چھپ سے پانی میں گریں۔ انکے منہ سے صرف یہ نکلا: ''شہاب الدین .... آتا، میں چلی!'' ریڈیو میں آواز آئی ''دمادم مست قلندر''۔ خدیجہ بیگم اور رابعہ بیگم بھاگیں۔ دادی اماں کو اُٹھانے کی کوشش کی تو دیکھا کہ انکی آنکھیں تو پھر گئی تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا کہ انکا کام ہو گیا۔ ادھر سے شہاب الدین بھاگے اور اپنی والدہ کو اُٹھانے میں مدد کی۔ انکو اندر برامدے میں جاتے جاتے ہوش آنا شروع ہو گیا تھا۔ ہاتھ پیر مار رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے بال نوچنے شروع کئے''مُرغی، مرغی مرغی! ہائے مرغی ...مرغی ہٹاؤ''۔ ریڈیو نے پھر ٹھیکا دیا ''دمادم مست قلندر''۔ صحن میں جنت اور ماہ نور پانی میں ناچ رہی تھیں: ''دمادم مست قلندر، دادی اماں مست قلند، مرغا مرغی مست قلندر'' اس معرکے میں گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ کسی کو ہوش نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس وقت باہوش وہ ہمسائے کا لڑکا رضوان تھا جو چاہ رہا تھا کہ کسی طرح سے موری کھل جائے۔ اس نے مرغیاں ہانکنے کا ڈنڈا اُٹھایا، دڑبے میں گھسا اور موری کھولنے کی کوشش کی۔ موری میں مرغیوں کے پروں اور ان کی گندگی کے مرکب سے اینٹ مضبوطی

سے جم چکی تھی۔ بوتل میں ڈاٹ کی طرح موری سیل ہو چکی تھی۔ اُس نے ڈنڈا مار مار کر نالی کھولی، باہر جا کر اینٹ نکالی اور پانی کا تالاب خالی ہونا شروع ہوا۔

رضوان: ''یار واجد، اپنی مرغیوں کو قابو کرو، انکو ٹوکرے میں بند کرو۔ دڑبہ بھول جاؤ، کہاں ہے ٹوکرہ، مرغیوں کو ٹوکرے میں بند کرو''۔

تھوڑی دیر میں دیکھا تو واجد ٹوکرہ سر پر رکھے ہوئے آ رہے ہیں۔

جنت: ''واجد بھائی آپ نے ٹوکرہ کیوں اوڑھ لیا، آپ تو بالکل مرغا لگ رہے ہیں۔ واجد بھائی مرغا قلندر''

ماہ نور: ''دما دم مست قلندر''

آج ہنگامے کی وجہ صرف مرغیاں تھیں۔ سب نے مل کر محاذ بنا کر مرغیاں قابو کیں اور سب کو ٹوکرے میں بند کر لیا۔ فی الحال مرغیوں کا دڑبہ نا قابلِ استعمال قرار دیا گیا۔ اس معرکۃ آرا دن میں پہلی مرتبہ سکون کی کرن نظر آئی۔

رابعہ بیگم: ''اے خدیجہ دیکھ رہی ہو، میری تو ساری شلوار گیلی ہو گئی اس موئے صحن کی صفائی میں۔ میں شلوار تو بدل لوں اور تم بھی شلوار بدل لو۔ اف فو! بس طوفان بدتمیزی میں آج کا دن گزرا ہے۔''

دادی اماں: ''ارے کوئی ہے؟ اری کمبخت، جنت کیا دیکھ رہی ہے، میرے بالوں میں سے مرغی کے پر نکال، لا کنگھی۔''

جنت: ''کوئی پر ور نہیں ہے دادی اماں، آرام سے کپڑے سوکھنے دیں۔''

رضوان باہر سے بھاگا بھاگا آیا اور صاحب خانہ مومن علی خاں سے مخاطب ہوا: ''انکل باہر کوڑے کے ڈرم میں سے کڑک کڑک کی آواز آ رہی ہے، مجھے آپ کا صف شکن معلوم ہوتا ہے''۔

مومن علی: ''ہیں تمہارے منہ میں گھی شکر، چلو چلو کہاں ہے۔ مرغہ بولا ککڑوں کوں!''

جنت شہاب الدین

شہاب الدین کا خاندان جب ہنگامۂ صفائی سے واپس اپنے گھر آیا تو ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک بڑی مہم سر کر کے واپس آئے ہیں۔ سب تھکے ہوئے تھے۔ دادی اماں کے جوڑوں میں درد کی شدت بہت بڑھ چکی تھی۔ وہ بار بار اپنا سر کھجاتیں اور دعویٰ کرتیں کہ انکے بالوں میں مرغی کی بیٹ موجود ہے، حالانکہ انکے بال دھوئے جا چکے تھے۔ دادی اماں اپنی بہو سے مخاطب ہوئیں: ''اے رابعہ دلہن، بٹی ایک دفعہ میرے بال سیکا کائی اور آملہ سے اچھی طرح دھو دو، کسی طرح یہ مرغی کی بساند تو نکلے۔ سمجھے نہیں سمجھے''۔

رابعہ بیگم اپنی بٹی سے مخاطب ہوئیں: ''اس ہنگامے کی ذمہ دار جنت تم اور صرف تم ہو۔ اتنی سی عمر میں صحن گندہ لگنے لگا ہے نازک مزاج کو۔ مرغیوں کی بُو ناگوار لگنے لگی ہے۔ مفت میں صحن دھلوا دیا۔ سب عمر بھر یاد رکھیں گے۔''

شہاب الدین: ''ارے چھوڑو ان باتوں کو بیگم۔ مجھے روئی کی پھریری بنا دو، میرے کان میں ابھی تک پانی بھرا ہوا ہے۔ رات بھر چھینکیں آتی رہی ہیں۔ ناک بہہ رہی ہے اور کل دفتر جانا ہے۔''

دادی اماں: ''اُئے لو ناک نہ بہے گی تو کیا رال ٹپکے گی۔ مرغیوں کی گندگی سے کھیلو گے تو

شہاب الدین، یہی ہوگا۔ سمجھے نہیں سمجھے۔''

جنت: ''دادی اماں آپ کے سر میں کھجلی مرغیوں سے نہیں بلکہ بالوں میں خضاب لگانے سے ہے۔ آپ چنبیلی کا تیل ڈال کر امرت دھارا سونگھ لیں۔''

شہاب الدین: ''جنت، خاموش۔ کیا بدتمیزی ہے۔ کچھ زیادہ ہی تمہاری زبان کھلتی جا رہی ہے۔''

دادی اماں: ''شہاب الدین میری بات یاد رکھنا، سمجھے نہیں سمجھے۔ تم نے اس کو انگریزی پڑھا کر غلطی کی ہے۔ اس کی عمر دیکھو اور اس کرنٹی سے... اے ہے وہی موئی مارلین سے کیا فرفر فرکٹ پٹ کرلیتی ہے۔ سمجھے نہیں سمجھے۔''

جنت: ''دادی اماں، آپ سورۃ مزمل یا سورۃ واقع پڑھ کر سنا دیجئے، نہیں تو میں سناتی ہوں۔''

دادی اماں: ''اے دیکھ رہے ہو شہاب الدین اسکو! سمجھے نہیں سمجھے۔ اس نے میرے مرنے کی امید میں سورۃ یاسین بھی یاد کرلی ہوگی۔ جنت، میں اتنی جلدی مرنے والی نہیں۔ سمجھے نہیں سمجھے۔''

اس فرسودہ خاندان میں کسی کے پاس اتنا دماغ نہ تھا کہ وہ جنت کو سمجھ سکتے۔ جسمانی پرورش کے مقابلے میں اس کا دماغ کافی بلندیاں عبور کر چکا تھا۔ اس کا جسم اپنی عمر سے پیچھے اور اس کا دماغ اپنی عمر سے آگے پرورش پا رہا تھا۔ وہ وقت سے زیادہ تیز چلنا چاہتی تھی۔ اس کو ہر گھڑی اور ہر کیلنڈرز کا ہوا لگتا تھا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ ہر مشاہدے کے بعد اس کے ہاتھ جنبش میں آنے لگتے اور اس کے قدم اُٹھنے لگتے تھے۔ آنکھیں چمکنے لگتیں۔ زبان سے نکلتا ''اب میں کیا کروں''۔ اور وہ کچھ نہ کچھ کر بیٹھتی تھی۔ اس کی نگاہ صحن میں چارپائیوں سے اُچٹ کر اس چارپائی پر پڑتی جس میں بان نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس ڈھانچے کو کھڑا کر کے اس میں لٹک جاتی اور ڈنڈ نکالنا شروع کر دیتی، یا

اس فریم کو زمین پر گرا کر اس سریان پر بیلنس کر کے کھڑی ہو جاتی اور نٹنی بننے کی کوشش کرتی۔ ہاتھوں کے بل زمین پر اُلٹی کھڑی ہو جاتی اور ہاتھوں پر چلنا شروع کر دیتی۔ ایک روز اپنے پلنگ پر بیٹھ کر اپنی ٹانگ اپنی گردن کے اوپر ڈال لی۔ وہاں سے اپنی ٹانگ اُتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دادی اماں نے دیکھا کہ جنت گول مٹول ہو کر پلنگ پر گھوم رہی ہے۔ پھر کیا تھا وہ بھاگی بھاگی آئیں، اسکی ٹانگ گردن پر سے اُتاری اور اس کی کمر پر دو ہتڑ مارا ''نیک بخت چھوڑ دے اپنی حرکتیں۔ پتہ نہیں کہاں سے نٹنی کا خون تجھ میں آ گھسا ہے۔ کم بخت پیٹ کی ساری رگیں اُلٹی ہو جائیں گی۔ ٹلے دب گئے تو کیا کرے گی۔ کیا میرے چونڈے میں کلپ لگوائے گی۔''

جنت: ''دادی اماں میرا جسم ایسا ہے تو میں کیا کروں۔ مجھے ٹانگ گردن پر ڈالتے ہوئے کوئی تکلیف تھوڑی ہوتی ہے۔ مجھے تو مزہ آتا ہے۔ دادی اماں ٹلے کیا ہوتے ہیں؟''

دادی اماں: ''اللہ! اس بچی کو نیک راہ پر چلاتا۔ مجھے اس کے لچھن ٹھیک نہیں نظر آتے۔ نامراد ہوش میں آ! کیا سارے خاندان کا منہ کالا کروائے گی۔ سمجھے نہیں سمجھے۔''

جنت ابھی دس سال کی نہ ہوئی تھی کہ اپنے صحن میں اپنے ابا کی سائیکل چلا لیا کرتی تھی۔ باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دادی اماں کا پہرہ جتنا دن کو سخت تھا اُتنا ہی رات کو ہوتا۔ اپنے کوارٹر کے سامنے ہری گھاس کے تختے کو دیکھ کر اس کا دل مچل جاتا۔ وہ چاہتی کہ ایک تتلی کی طرح وہ بھی اُڑی اُڑی پھرے۔ جہاں دل چاہے شاخ پر بیٹھ جائے۔ پتوں کے سائے میں سو جائے۔ پھر چیل بن کر تیزی سے اُڑے اور جھپٹا مار کر اپنی من مانی چیز جھپٹ لے۔

جون کا مہینہ تھا، اور خوب تیز لو چل رہی تھی۔ گرمی ایسی تھی کہ چیل انڈا چھوڑ دے۔ چلچلاتی دھوپ میں نکلنے والا وہی ہوتا تھا جس کو آفتِ ناگہانی کا سامنا ہو۔ اور جو نکلتا سر اور گردن کو کپڑے میں لپیٹ کر ہانپتا کانپتا نکلتا۔ چڑیاں چونچ کھولے، زبان

نکالے، خاموش چوں میں چھپی بیٹھی تھیں۔ شہاب الدین نے ایک کمرہ اس بلا کی گرمی سے بچنے کے لئے ٹھنڈا کر رکھا تھا۔ دروازے اور کھڑکیوں پر خس کی ٹٹیاں لگا کر صبح ہی سے پانی ڈلوانا شروع کر دیا تھا۔ ہلکا ہلکا پنکھا چلا دیا تھا تا کہ کمرے کے اندر فضا اس قابل ہو جائے کہ دوپہر کے دو تین گھنٹے سب لوگ آرام کر سکیں۔ دوپہر کا کھانا کھا کر دادی اماں، شہاب الدین، انکی بیگم اور جنت سب کے سب ٹھنڈے کمرے میں دریوں پر دراز ہو گئے، لیکن ایک کام جنت کے سپرد کیا گیا کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پانی کو چیک کرتی رہے۔ خس کی ٹٹی خشک نہ ہونے پائے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دوزخ کے ایک کونے میں چھوٹی سی جنت بنی ہوئی ہو۔ تھوڑی دیر میں سب لوگ اونگھ گئے۔ دادی اماں نے خراٹے لینے شروع کر دیے۔ لیکن اس جنت میں، جنت کیسے سوتی، اس کو تو ڈیوٹی ملی ہوئی تھی۔ وہ دادی اماں کے خراٹوں کو نہ صرف سن رہی تھی بلکہ انکے ہونٹوں کو بھی دیکھ رہی تھی۔ انکے ہونٹ ''پوں'' کہتے ہوئے اندر جاتے اور ''پھس'' کی آواز کے ساتھ باہر نکلتے۔ جنت کو خیال آیا کہ خس کا پانی ضرور خشک ہو چکا ہوگا۔ وہ چپکے سے باہر نکلی۔ برآمدے میں لُو کا بھبکا لگا۔ پورا گھر، پورا محلہ، پورا شہر سنسان پڑا تھا۔ جنت کو ایسا لگا جیسے صرف وہ اپنی ڈیوٹی پر تعینات تھی اور ساری دُنیا خواب خرگوش میں اتنا غفیل ہو چکی تھی۔ وہ اس وقت حکمران وقت تھی۔ ٹہلتی ہوئی صحن میں گئی۔ پیر جلنے لگے تو بھاگی بھاگی اندر برآمدے میں آئی۔ گرمی بہت تھی۔ اس کی چٹیا میں سے آگ نکل رہی تھی۔ اس نے چٹیا کھولی اور بال کندھوں پر ڈال کر ہوا دینے لگی۔ اپنے ہمزاد سے پوچھا ''اب میں کیا کروں؟'' سامنے اس کو اپنے ابا کی سائیکل کھڑی نظر آئی۔ سائیکل تو وہ چلا سکتی تھی۔ بھاگی بھاگی سائیکل کو پکڑا۔ اس کا ہینڈل اتنا گرم تھا کہ ہاتھ جلنے لگے۔ ایک لوٹا بھر کر سائیکل کے ہینڈل پر ڈال کر اس کو ٹھنڈا کیا اور سائیکل باہر لے گئی۔ باہر چاروں طرف نہ آدم نہ آدم زاد۔ نہ تانگے نہ کار، نہ چڑیا نہ سائیکل سوار۔ آج جنت کی حکومت تھی۔

سائیکل پر سیر کرنے کا آج ہی کا دن تھا۔

سامنے گھاس کے میدان میں وہ پوری مہارت سے سائیکل کو لے کر کبھی اِدھر جاتی اور کبھی اُدھر۔ چلچلاتی دھوپ میں اس کے کھلے بالوں میں لُو نے کنگھی کی۔ سائیکل کی رفتار نے بالوں کو اُڑایا۔ اس نے زور زور سے پیڈل مار کر سائیکل کو تیز چلانے کی کوشش کی لیکن گھاس پر سائیکل تیز ہو کر نہ دی۔ وہ سائیکل سے اُتر کر سائیکل کو سڑک کے کنارے لے کر کھڑی ہو گئی۔ سڑک سنسان پڑی تھی، نہ کوئی مسافر نہ راہ گیر، نہ باپ نہ فقیر۔ اس کو ایسا لگا کہ آج سڑک صرف اس کی منتظر تھی۔ وہ سائیکل پر سوار ہوئی اور سڑک پر تیز تیز سائیکل چلانی شروع کر دی۔ جنت کو جنت کا مزہ آنے لگا۔ بال جنت کی کمر کو چھوڑ کر لُو میں لہرانے لگے۔ اس نے مڑ کر دیکھا، اس کا کوارٹر دور ہو چکا تھا۔ وہ سائیکل سے اتری اور اپنا رُخ بدلا اور اپنے گھر کا رُخ کیا۔ سائیکل پر زور سے اور تیزی سے پیڈل مارے۔ چکنی سڑک پر سائیکل اور تیز ہوئی اور جنت کو اس کے گھر سے اور آگے لے گئی۔ آج سڑکوں پر جنت کا راج تھا، مگر پتہ نہیں کہاں سے؟ ایک موڑ پر سے ایک تانگہ نکل آیا۔ ناتجربہ کار سائیکل سوار اس تانگے کے وجود کو نہ سمجھ سکی۔ اس نے گھوڑے کی ٹانگوں کے بیچ میں سے اپنی سائیکل نکالنے کی کوشش کی۔ جنت کا سر گھوڑے کے پیٹ سے ٹکرایا۔

تانگے کے کوچوان اور دو مسافروں نے جنت کو سنبھالا۔ وہ زخمی ہو گئی تھی۔ کئی جگہ چوٹیں آئیں تھیں۔ لیکن وہ ہوش میں تھی، اس نے اپنے کوارٹر کا نمبر بتایا۔

شہاب الدین نے جب خس کی خشکی محسوس کی تو جنت کو آواز دی۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو جنت کو آواز دیتے ہوئے وہ باہر صحن میں آئے۔ انکی گھبراہٹ میں جنت کو پکارنا سارے گھر کو جگانے کے لئے کافی تھا۔ سب باہر صحن میں آئے۔ دیکھا تو سائیکل غائب تھی اور دروازہ کھلا پڑا تھا۔ ''میری بچی، میری بچی'' کہتے ہوئے اہلِ خانہ میدان

میں آئے۔ وہاں تو ایک چڑیا تک نہ تھی۔ شہاب الدین سڑک پر آئے تو دیکھا کہ تین آدمی جنت کو سنبھالے ہوئے انکی طرف آ رہے ہیں۔ اُن کے پیچھے تانگہ کھڑا تھا اور اس کے برابر میں ٹوٹی ہوئی سائیکل پڑی تھی۔ جنت کے بال کھلے تھے۔ دوپٹہ ندارد اور جگہ جگہ خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ ہاتھ سوج چکا تھا اور وہ اپنے باپ کو دیکھ کر زار و قطار رونے لگی۔

کوچوان: ''صاحب جی ان مسافروں سے پوچھ لو، بٹیا کو سائیکل چلانی نہیں آتی۔ موڑ پر تانگہ دیکھ کر بریک نہ لگا سکیں اور تانگہ میں گھس آئیں۔''

جنت: ''ابو غلطی میری ہے۔ تانگے والا صحیح کہہ رہا ہے۔ میرے ہاتھ میں سخت تکلیف ہے ... ابو ڈاکٹر''

دادی اماں نے جنت کے کھلے بال اور کپڑوں میں خون دیکھ کر سر پیٹ لیا۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں گھاس پر بیٹھ گئیں اور چیخنا شروع کر دیا ''جنت میری بچی جنت یہ تیرے ساتھ کیا ہوا۔ مجھے بتا یہ کون تھا۔ میں اسکا خون پی جاؤں گی... ہائے جنت!''

سب مل کر جنت کو ٹھنڈے کمرے میں لے گئے۔ جنت کے زخموں کا شمار لیا گیا۔ زخم معمولی تھے، مگر ہاتھ میں سوجن خطرناک معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہاتھ نہیں لگانے دے رہی تھی۔ دوپہر ڈھلتے ہی جنت کو ڈاکٹر کے پاس لیکر گئے اور جنت کے ہاتھ پر پلستر چڑھایا گیا۔ ایکسرے نے ہاتھ کی ہڈی میں فریکچر قرار دیا تھا۔

ایک مہینے بعد جنت کی بارہویں سالگرہ تھی۔ جنت کے ہاتھ پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا لیکن پھر بھی سالگرہ کو شان کے ساتھ منانے کا پروگرام مرتب کیا گیا۔ جنت کی ماں نے اپنے اپنے خاندان اور رفقاء کو دعوت پر مدعو کیا۔ مومن علی کا خاندان اور ان کے ہمسائے، جن میں جنت کی بیسٹ فرینڈ ماہ نور اور اس کا بھائی رضوان بھی شامل تھے، مدعو کئے گئے تھے۔ جنت نیا جوڑا پہن کر اور گھنے بالوں کا جوڑا بنا کر ماں کے ساتھ کھڑی ہوئی

تو اس کا قد اپنی ماں کے قد سے تجاوز کر چکا تھا۔ آنکھوں کی چمک زیادہ روشن ہوگئی تھی مگر شرارت جھلکتی تھی۔ پلکیں زیادہ سیاہ ہو رہی تھیں اور آنکھوں نے بیضوی شکل اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ سب کو ایک طوفان کا پیش خیمہ نظر آرہا تھا۔

سالگرہ کی رسم نہایت سیدھی سادی تھی۔ باہر شامیانے لگے۔ ظہر کی نماز کے بعد سب جمع ہوئے۔ سب نے جنت کو ہار پہنائے۔ مومن علی نے دعا پڑھی اور کھانا شروع کیا گیا۔ سہیلیوں نے جنت کو گھیرے میں لئے رکھا۔ کبھی کمرے میں سرگوشیاں ہوتیں اور کبھی صحن میں شوخیاں ہوتیں۔ لڑکیوں نے کسی اور کو اپنے جھرمٹ میں نہ آنے دیا۔ دادی اماں تو ہر وقت جنت پر نگاہ رکھنے کی عادی تھیں۔ جب کافی دیر جنت آنکھوں سے اوجھل رہی تو انہیں بے چینی ہوئی کہ پتہ نہیں لڑکیاں کیا کر رہی ہونگی۔ وہ صحن میں لڑکیوں کے جھرمٹ میں بغیر اجازت گھس گئیں۔ وہاں سے چیختی ہوئی بھاگتی واپس آئیں۔ ''ہائے اللہ، رابعہ دلہن، ہائے اللہ میں کیا کروں۔ کچھے نہیں کچھے۔ اور پڑھاؤ انگریزی اسکولوں میں۔ لو جاؤ، دیکھو اپنی آنکھوں سے۔ دُنیا میں لڑکیاں یہ بھی کر سکتی ہیں۔ کچھے نہیں کچھے۔ جاؤ رابعہ اپنی آنکھوں سے دیکھو۔ یہ تمہاری بچی کیا کر رہی ہے۔ اس کے کرتوت دیکھو۔ جاؤ میری نہ مانو، اپنی آنکھوں سے دیکھو رابعہ''۔ جنت کی والدہ نہایت گھبراہٹ کی حالت میں بچیوں کی ناجائز حرکتیں دیکھنے کے لئے پہنچیں۔ دیکھتی کیا ہیں کہ جنت نے اپنے ہاتھ کا پلاسٹر اتار لیا تھا اور اس کو دھلوا کر بنا کر منہہ پر لگا رکھا تھا اور وسل بجا رہی تھی اور ساری لڑکیوں نے اس کے کپڑے پکڑے ہوئے ریل گاڑی بنا رکھی ہے۔ آگے آگے جنت پلاسٹر کو منہہ سے لگا کر چھک چھک کی آواز نکال رہی ہے اور ساری لڑکیاں سیٹی بجا رہی ہیں۔ جنت کی ماں خاموشی سے واپس چلی گئیں اور اپنے شوہر کو بلایا اور ان کو سارا سین سمجھایا۔ شہاب الدین نے کہا ''یہ جنت نے بُرا کیا، لیکن اس وقت تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، مہمان چلے جائیں تو بات کریں گے۔''

شہاب الدین شامیانے میں جا کر مہمانوں کے ساتھ بیٹھے لیکن وہ اپنی بیٹی کے ہاتھ کے فریکچر کے بارے میں سوچتے رہے۔ ابھی پلاسٹر کو اتارنے میں وقت تھا اور لڑکی نے وقت سے پہلے اتار کر اچھا نہ کیا تھا۔ مہمانوں میں مومن علی کا بیٹا واجد بھی بیٹھا تھا۔ وہ منگیتر جس کو اپنی منگنی کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا۔ شہاب الدین اپنے ہونے والے داماد سے مخاطب ہوئے "کہیے بیٹا آجکل کیا شغل ہے۔ کونسا گیم کھیل رہے ہیں آپ آجکل"۔

واجد علی: "میں کے رم کھیلتا ہوں"۔

شہاب الدین: "کیا کھیلتے ہیں آپ؟"

واجد علی: "کے رم۔ تین چار شوٹ میں کوئین پوٹ کر دیتا ہوں، سب کو ہرا دیتا ہوں"

شہاب الدین: "ابھی تو آپ سیکنڈ ائیر میں ہیں نا، آپ کے سبجیکٹ کیا ہیں"

واجد علی: "میرے پاس اکاؤنٹ کے سبجیکٹ ہیں۔ میں ابا کی طرح اکاؤنٹنٹ بنوں گا، ابا نوکری دلا دیں گے۔"

مہمانوں کے جانے کے بعد شہاب الدین نے اپنی بیٹی کو بلایا۔ جنت شرماتی ہوئی پلاسٹر چڑھے ہوئے ہاتھ کے ساتھ دوپٹہ اوڑھے اپنے باپ کے سامنے آئیں اور ادب سے بیٹھ گئیں۔

"بیٹی آپ پلاسٹر کیسے اتار لیتی ہیں، اس وقت تو چڑھا ہوا ہے"

"ابو! جب ڈاکٹر نے پلاسٹر چڑھایا تھا تو ہاتھ میں کافی سوجن تھی، کوئی بیس دن میں میری سوجن ختم ہو گئی تھی اور پلاسٹر ڈھیلا ہو گیا تھا۔ بڑی کھجلی ہوتی تھی۔ میں نے اس کو گھما گھما کر ڈھیلا کر لیا تھا۔ اب ایسے ہو گیا ہے کہ جب دل چاہے اتار لوں۔ میرا ہاتھ مجھے ٹھیک لگتا ہے۔ میں ہاتھ پر زور لے سکتی ہوں۔"

"بیٹی آپ کون ہیں یہ کہنے والی کہ ہاتھ ٹھیک ہے۔ یہ تو ڈاکٹر اور ایکسرے ہی بتا سکتا

ہے۔ آپ نے ایک خطرہ مول لیا ہے۔ کل ڈاکٹر کے پاس جانا ضروری ہے۔''

واجد علی خاں

مومن علی خاں کا معمول تھا کہ وہ فجر کی آذان پر اٹھتے اور نماز پڑھنے کے بعد انہیں اپنی مرغیاں یاد آتیں اور وہ بے تاب ہو کر ان کے لئے دانہ لے کر جاتے، مرغیوں کو کھول کر انکو دیکھ کر خوش ہوتے، پھر بڑے پیار سے انکو دانہ ڈالتے۔ چھٹی ہو یا نہ ہو، عید ہو یا نہ ہو، اپنی اس روٹین میں انہوں نے کبھی فرق نہ آنے دیا۔ فرق آ بھی کیسے سکتا تھا، انکا کوئی اور شوق تھا ہی نہیں۔ مرغیاں پالنے کے بعد انہوں نے نہ کبوتر بازی کی اور نہ ہی پتنگ بازی۔ نہ کبھی قسم کھائی اور کبھی جوا نہ کھیلا۔ انہیں یہ پتہ ہی نہ تھا کہ کوٹھا کس شکل کا ہوتا ہے۔ اپنے گھر اور دفتر میں مقید، وہ ایسے انسان تھے جن کی دنیا ایک بیوی اور ایک فرزند ارجمند واجد علی خاں پر مشتمل تھی۔ گنتی کے چند دوست ضرور تھے جن میں سب سے نمایاں کمال پاشا تھے جنکو بیسٹ فرینڈ کا خطاب دیا جا سکتا تھا۔ ان سے کبھی کبھار میدانِ کارزار پر سامنا ہوتا تھا (انکے ہاں کیرم بورڈ کو میدانِ کارزار کہا جاتا تھا) اکثر معرکہ باپ اور بیٹے کے درمیاں ظہور پزیر ہوتا یا میاں اور بیوی کے درمیان صف آرائی ہوتی۔

اگر کسی دوست کے ساتھ جنگ آرائی ہوتی تو مومن کے جنگی اصولوں، شجاعت اور اسکور کاؤنٹنگ کو مدِنظر رکھتے ہوئے، مہمان جلدی ہی میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا کیونکہ ایک زاہدِ خشک سے جس کا پیشہ اکاؤنٹنگ ہو کیرم کھیلنا عذابِ الٰہی سے کم نہ ہوتا تھا۔ وہ چیٹنگ کرنے ہی نہیں دیتے تھے۔

مومن صاحب کی زندگی کا صرف ایک مقصد رہ گیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ انکا بیٹا کسی طرح ان جیسا اکاؤنٹنٹ بن جائے تاکہ باپ کا نام روشن ہو۔ ابھی صاحب زادے فرسٹ ایئر ہی میں پہنچے تھے کہ انہوں نے بیٹے پر خاص توجہ دینی شروع کر دی اور کالج کی تعلیم کو ہر زاویئے سے مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ جہاں مغرب کی نماز ختم ہوئی وہ اپنے لاڈلے کو لے کر بیٹھ جاتے اور اس کو باتوں باتوں میں بہت کچھ سمجھا دیتے۔ وہ تلقین کرتے کہ صاحب زادے کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونا ہے اور وہ سخت محنت کر کے علم حاصل کرے۔ وہ اپنی مثال دیتے کہ انہوں نے اپنا مقام سخت محنت اور متواتر محنت سے پایا تھا۔ سخت مقابلے کے بعد اور اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کے بعد ہی وہ اس قابل ہوئے تھے کہ انگریز بھی ان کی عزت کرنے لگے تھے۔ صاحب زادے واجد بھولی بھولی شکل سے اپنے ابا سے پوچھتے "ابا۔ میری تعلیم مکمل ہونے تک آپ اور بڑے افسر بن جائیں گے۔ مجھے نوکری دلا دیں گے نا؟"

جوں جوں دن گزرتے گئے، مومن صاحب کو یہ احساس ہوتا گیا کہ انکا بیٹا عقل کا کھوتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ دس اور پانچ پندرہ ہوتے ہیں لیکن جب اس کو یہ سمجھایا جاتا کہ دس کا ہندسہ اپنی جگہ پر غلط تھا وہاں بارہ کا ہندسہ ہونا چاہیئے تھا تو وہ پریشان ہو جاتا۔ اس کی ہندسہ شناسی اور ہندسہ شماری صحیح تھی لیکن ہندسہ بنجی اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ جب باپ کو یہ احساس ہوا تو انہوں نے اور زیادہ توجہ اور وقت دینا شروع کیا لیکن لڑکے سے کوئی خاص ترقی کے امکانات ظاہر نہ ہوئے۔ واجد علی باپ کی نگرانی میں

اور کالج کے زیر تعلیم پڑھتا رہا۔ اپنی کلاس میں کبھی فیل نہ ہوا مگر کبھی اچھے نمبروں میں پاس نہ ہوا۔ وہ اس امید پر تکیہ کئے ہوئے رہا کہ اس کو اسکے والد اچھی نوکری دلا دیں گے۔

مومن علی کے ہمدرد اور دفتری دوست کمال پاشا نے واجد علی کے بارے میں اپنے دوست کو مشورہ دیا کہ بڑھتی جوانی میں لڑکوں کو دماغی ورزش کے علاوہ کوئی کھیل کھیلنا یا جسمانی ورزش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ واجد علی گھر گھسنے بنے بیٹھے رہتے ہیں، ذرا باہر نکلیں، دوڑیں لگائیں، فٹ بال کھیلیں، ہاکی کھیلیں اور اودھم مچائیں۔ یہ ان کے واسطے بہتر ہو گا۔ دماغ روشن ہوگا۔

مومن علی: ''کمال بھائی آپ ہی واجد کو سمجھایئے وہ آپ کی بات بہت مانتا ہے۔''

کمال پاشا نے واجد کو بلایا ''میاں واجد، کالج میں کوئی فٹ بال ٹیم ہے؟''

واجد: ''جی ہاں ہے، اس میں بڑے بڑے لڑکے کھیلتے ہیں''

کمال: ''تو آپ کیوں نہیں کھیلتے؟''

واجد: ''وہ بہت اچھا کھیلتے ہیں۔ میں ہاکی کھیل سکتا ہوں''

کمال: ''وہ تو اور بھی اچھی بات ہے، وہ کھیلئے اور ضرور کھیلئے''

واجد: ''اس میں چوٹ لگ جاتی ہے لیکن میں کھیل سکتا ہوں''

کمال: ''ضرور کھیلئے اور کھیل کے بعد روزانہ گراؤنڈ کے چار چکر دوڑ کر لگایئے تاکہ سانس بنے اور تھکاوٹ کی عادت پڑے''

واجد نے دو دن ہاکی کھیلی، تیسرے دن اس کے پیر میں چوٹ لگ گئی۔ پٹی باندھی گئی، یہ ان کے لئے ضرب کاری تھی۔ وہ اپنے ابا کے پاس شکایت لے کر پہنچے ''میں کمال انکل کے کہنے پر ہاکی کھیلا، میرے واسطے انہوں نے مصیبت ڈال دی۔ اب یہ چوٹ کیسے اچھی ہوگی۔ میں ہاکی واکی نہیں کھیلوں گا''۔ مومن صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ اولاً یہ پریشانی کہ بچے کو چوٹ لگ گئی، دوسرے یہ کہ صاحب زادے ایک چوٹ سے گھبرا گئے۔

یہ آئندہ وچونوں کا کیا کریں گے۔

واجد شرماتے رہے اور دن گزرتے گئے۔ موسم بدلتے گئے۔ چلچلاتی دھوپ کے بعد کالے بادل جھوم جھوم اُٹھے۔ درختوں میں جھولے پڑے، آموں کے ڈھیر لگے، پروا چلی اور اس نے دیواروں پر لگے کیلنڈروں کے اوراق اُڑائے اور اُڑاتے اُڑاتے برسات ختم ہونے کا سندیسہ دے گئی۔ سال ختم ہوا، دوسرا سال آیا، بہار آئی، خزاں آئی۔ موسم سرما میں کڑکڑاتی سردی میں پالا پڑ رہا تھا۔ شہاب الدین اپنی ماں کے ساتھ رضائی اوڑھے، مٹی کی انگیٹھی لئے اُپلوں کی چنگاری سے ہاتھ سینک سینک کر مونگ پھلیاں چھیل چھیل کر کھا رہے تھے۔ ان کی والدہ، جنت کی دادی اماں کسی سوچ میں تھیں۔ پھر ایک دم رضائی منہ پر سے ہٹا کر بولیں:

''اے شہاب الدین...ارے سنتے ہو، شہاب الدین۔ جنت نویں جماعت میں ہے نا؟ ارے اس کو اسکول سے یہ کونسا انعام مل گیا؟''

''اماں یہ ڈیبیٹنگ کا انعام ہے۔''

''اے وہ کیا ہوتی ہے؟''

''اماں کسی مسئلہ پر بحث کرنے کو کہتے ہیں۔ اسکول میں اس نے سب سے اچھی بحث کی تھی تو اس کو اول انعام ملا۔''

''یہ لو ...اور سنو، بحث کرنے پر بھی انعام ملنے لگے! جب ہی میں کہوں کہ اس کو کیا ہو گیا ہے کہ ہر بات پر بحث کرتی ہے۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ میری تو وہ کوئی بات مان کر ہی نہیں دیتی۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ آگ لگے ان انگریزی اسکولوں کو۔ میری معصوم کے دماغ میں خلل ڈال دیا۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ ارے شہاب الدین، اپنی بیٹی کی اُٹھان دیکھی ہے تم نے۔ اپنی ماں سے اونچی ہو گئی ہے۔ مجھ سے ایک فٹ اونچی ہے۔ ماشاءاللہ۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ کیا رنگت نکالی ہے۔ شہاب الدین، اس کا

چودھواں سال شروع ہو گیا ہے اور اس بزرگی کی حرکتیں دیکھی ہیں تم نے؟ کل وہ اپنے پیروں میں پیسے باندھ لائی۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ اور وہ اس کی گوری سہیلی، کیا نام ہے اس کرنٹی کا... مارلوں، مارلیس کچھ ایسا ہی ہے۔ اس نے بھی اپنے پیر میں پیسے باندھ لئے۔ یہ سب اس گوری نے چسکا لگایا ہوگا۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ دونوں کی دونوں، ساری دوپہر صحن میں گھر گھر کرتی پھری ہیں۔ میں نے دونوں کو بہت سمجھایا کہ لڑکی ذات ایسی حرکتیں نہیں کرتیں، نلے اوپر نیچے ہو جاتے ہیں۔ دونوں میں سے کسی نے بھی میری بات نہ مانی۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ شہاب الدین ہوش میں آؤ... یہ لڑکی ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ یہ لڑکی نمی ہے نمی!۔ ہمارا منہ کالا کرائے گی۔ اپنی اس گوری سہیلی سے ایسی فرفر، فرفر انگریزی بول رہی تھی۔ میں تو ہکا بکا رہ گئی۔ اپنی زبان بول نہیں سکتی اور انگریز سہیلی سے کیا فراٹے سے گٹ پٹ کر رہی تھی۔ شہاب الدین بہت ہو گیا۔ اب اس کو اپنے گھر کا کرو۔ سنا ہے تم نے؟ شادی کرو۔''

''اماں بی میں صاف صاف کہہ دوں کہ جب تک اس کی تعلیم پوری نہ ہوگی، میں اس کی شادی نہیں کروں گا۔''

''خدیجہ نے ٹوہ لینے کو مجھ سے پوچھا تھا کالج میں لڑکے کی تعلیم ختم پر ہے، تھوڑے دنوں میں انٹر پاس کر لے گا۔ ابا اتنے بڑے افسر ہیں نوکری مل جائیگی۔ اے شہاب الدین، سن رہے ہو نا۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ اور اس منگنی کا راز کب تک چھپاؤ گے لڑکی سے۔ میں تو کہتی ہوں کہ جنت کا خدیجہ کے ہاں جانا بند کرو اور پوری بات سب کو بتا دو۔''

''اماں جی، آپ فکر نہ کریں۔ آجکل چودھ پندرہ سال کی بچی کی شادی نہیں ہوتی۔ اس کی تعلیم تو پوری ہونے دیں۔''

''اگر بی اے بھی پاس کر لیا تو کیا ہوا، جانا تو ہے اس کو چولہے چکی میں۔''

''مجھے سوچنے دیں!''

''اے کیا سوچو گے شہاب الدین؟ میں نے بول دیئے ہیں۔ اسلام میں وعدہ نبھانا فرض ہے۔ شکست پڑھت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اللہ کی گواہی افضل ہے۔ میں جان دیدوں گی مگر وعدہ پورا کروں گی۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ بس بہت ہو گیا شہاب الدین۔''

''اچھا اچھا اماں، میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ آپ جنت سے کچھ ذکر نہ کیجئے، اسے پڑھنے دیجئے۔ وقت آنے پر میں خود سب کچھ سنبھال لوں گا۔''

اگلا ساون ابھی برسا نہیں تھا کہ جنت کا میٹرک کا نتیجہ نکل آیا۔ جنت نے نہ صرف فرسٹ ڈویژن حاصل کیا بلکہ بورڈ کے کامیاب طالب علموں میں اس کی چوتھی پوزیشن قرار دی گئی۔ اخباروں کی شہ سرخیوں میں جنت شہاب الدین کا نام چھپا۔ نہ صرف پورا خاندان بلکہ محلّہ دار اور رفقاء جمع ہوئے۔ ہر طرف سے مبارکبادوں کی بارش ہوئی۔ بہت سے خط آئے، کچھ تار آئے، مٹھائی بانٹی گئی۔ چند یا نے جنت کی قابلیت پر حیران نہ ہوئے بلکہ اس کا حسن و شباب دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ سرگوشیاں ہوئیں۔ ''اے ہے! اس کی بات پکی ہوئی یا نہیں'' اور دادی اماں سب کو ٹال دیتیں۔

اس زمانے میں دہلی کا سب سے اعلیٰ کالج سینٹ اسٹیفن کالج تھا جو کہ کشمیری گیٹ پر واقعہ تھا۔ وہاں داخلہ ملنا بہت مشکل تھا لیکن کالج کے پرنسپل جناب مکھرجی نے جنت کا کالج میں داخلہ کالج کے لئے باعثِ فخر سمجھا۔ داخلہ ہوا اور جنت نے کالج جانا شروع کیا ہی تھا کہ الزامات کا بازار کھل گیا۔ رشتے داروں نے کہنا شروع کیا ''سُنا تم نے! شہاب الدین کی لڑکی، لڑکوں کے کالج میں پڑھ رہی ہے۔ اور وہ بھی عیسائی مشن کالج میں۔ واقعی قیامت کے آثار ہیں۔ الاماں الحفیظ۔'' جنت کا داخلہ کسی اسلامیہ کالج میں ہوتا تو جنت کے ہونے والے سسرال کو شاید اعتراض نہ ہوتا مگر ایک مشن کالج کے لڑکوں کے ساتھ ایک لڑکی کا تعلیم حاصل کرنا، مرد مجاہد، پیکرِ زہد، مجسم واعظ، اسم بامسمہ مومن علی کو ناگوار گزرا۔ انہوں نے شہاب الدین اور جنت کی دادی اماں کو رجوع کیا

اور اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا۔ اور اصرار کیا کہ اگلی ہونے والی بہو کا مشن کالج میں لڑکوں کے ساتھ پڑھنا خاندان کے لئے بدنامی کا باعث ہو رہا ہے۔ لڑکی کو کالج سے اٹھا کر اس کی شادی فوراً کر دینی چاہیئے۔ شہاب الدین نے واضح الفاظ میں کہا کہ جنت جیسی روشن دماغ لڑکی کی اعلیٰ تعلیم ضروری ہے۔ شادی کے لئے لڑکی کی عمر بہت کم ہے اور وہ ذہنی طور پر ازدواجی زندگی کے لئے تیار نہیں ہے۔ شہاب الدین نے بات صاف کر دی، ''بچی کو چھوڑ یئے، اس چھوٹی عمر میں، میں خود اس کی شادی کے لئے تیار نہیں۔''

جنت کی مشن کالج میں تعلیم سب کی آنکھوں میں کھٹکتی رہی۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس خاندان کی تمام خواتین کا معیارِ تعلیم صرف قرآن پاک کو طوطے کی طرح پڑھنا تھا۔ داستانِ امیر حمزہ کے علاوہ کسی اور کتاب کو نہ پڑھایا جا سکتا تھا اور اگر کوئی غیر کتاب گھر میں آتی تو خاندان میں ہنگامہ کھڑا ہو جاتا تھا۔ تعلیم کے اس قسم کے گھریلو ماحول میں جوان لڑکی کا مشن کالج میں لڑکوں کے ساتھ پڑھنا قیامت سے کم نہ تھا۔ دادی اماں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ خاندان کی عزت بچا کر دم لیں گی۔ اور جنت کو اعلیٰ تعلیم کے جہنم سے بچا کر ہی دم لیں گی۔ انہوں نے خاندان کی اور محلے کی تمام خواتین کا محاذ بنایا کہ جنت کے والدین کو اس طوفان سے بچائیں جو ایک لڑکی کی اعلیٰ تعلیم سے کھڑا ہو سکتا تھا۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ خاندان اور محلہ الزام تراشنے کی فیکٹری بن گیا۔ روز ایک سے ایک نیا الزام کھڑا کیا جانے لگا۔ سب یہی کہتے تھے کہ جو کچھ بیان کیا جا رہا تھا وہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ فضا میں ایسے ایسے خوفناک تصورات نشر کئے کہ جنت کے والدین کانوں میں انگلیاں دے لیتے۔ وہ وقت بھی آ گیا کہ ہر نیا الزام نشتر بن کر والدین کے دل پر لگتا۔ جب حالات حد درجہ ناگوار ہو گئے تو دادی اماں ایک روز بیٹے سے مخاطب ہوئیں: ''اے شہاب الدین بیٹا، پر کا کوا بنتا ہے۔ کوا نہ ہو، بے شک نہ ہو لیکن پر ضرور ہو گا جس کو لوگوں نے کوا سمجھا۔ بات ضرور کچھ نہ کچھ ہے۔ سمجھے نہیں

سمجھے۔ عیسائیوں کا کالج ہے۔ سینکڑوں جوان لڑکوں کا ساتھ ہے، بچی بے حد خوبصورت ہے۔ کیا تمہاری بالکل ہی آنکھیں پتھرا گئی ہیں کہ نظر نہیں آرہا تمہیں۔ سمجھے نہیں سمجھے بیٹا! میں ہاتھ جوڑتی ہوں، خاندان کی لاج رکھ لے۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ جنت کو کالج سے اُٹھا اور ہاتھ پیلے کر۔ سمجھے نہیں سمجھے۔''

شہاب الدین حالات سے اتنا تنگ آ چکے تھے کہ اب مزید مقابلہ کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ دوسرے روز شہاب الدین نے اپنی لاڈلی بیٹی کو بلایا، اس کی ماں کو بلایا اور جنت کی دادی کو بلایا۔ کمرہ بند کر کے شہاب الدین رونے لگے۔ آنسوں پونچھ پونچھ کر کہنے لگے: ''میں جانتا ہوں جنت تو شبنم کی طرح پاک ہے۔ تجھ پر جو الزام تراشیاں ہوئی ہیں غلط ہیں۔ میرا خاندان تیری تابناک شخصیت کو سمجھنے کا اہل نہیں۔ تیری غلطی یہ ہے کہ اس فرسودہ خاندان میں پیدا ہوئی۔ میں اللہ سے معافی مانگتا ہو۔ بیٹی میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں۔ میں ان حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں تجھے کالج سے اُٹھا کر تیری شادی کر رہا ہوں۔''

جنت: ''ابا! ابا! آپ کو کیا ہوا ہے۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے پڑھنے دیجئے۔ میں شادی نہیں کروں گی۔ میں تیار نہیں ہوں۔ مجھے پڑھنا ہے........ ابو پلیز'' اور وہ زار و قطار رونے لگی۔

دادی اماں: ''بیٹی شادی تو سب کی ہوتی ہے۔ میرے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا''

جنت: ''جہنم میں جایئے آپ اور آپ کی شادی، میں شادی نہ کروں گی۔ میں پڑھوں گی''

جنت کی ماں: ''بیٹی ہم شرمندہ ہیں کہ ہم نے تم کو آج تک بے خبر رکھا۔ ہم نے تمہاری منگنی بچپنے میں واجد سے کر دی تھی''

جنت: ''کون؟ واجد بھائی؟ خالہ خدیجہ کا بیٹا؟''

ماں: ''ہاں... بیٹی''

جنت: ''آپ سب لوگ دیوانے ہو گئے ہیں۔ آپ کو پتہ نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور کس سے کہہ رہے ہیں۔ خاندان میں ہنگامہ تو اب کھڑا ہو گا'' یہ کہہ کر جنت کمرے سے باہر چلی گئی اور اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا۔

دادی اماں: ''اے ہے لڑکی آپے سے باہر ہوئی جاتی ہے۔ شہاب الدین، دو جوتے مارو ٹھیک ہو جائے گی۔ کل ہی دو بول پڑھوا دو، دھندے میں لگ جائیگی۔ جنت کیا ہمارے واسطے دوزخ بنی ہوئی ہے۔ نامراد... آوارہ.... چھنال۔

''اماں بی، آپ آج تک جنت کو سمجھ نہ سکیں۔ یہ سب آپ کی دقیانوسی ضد کا نتیجہ ہے۔

کافی دیر تک کمرے میں سکتہ چھایا رہا۔ کچھ دیر بعد، بہت خاموشی سے سب لوگ کمرے سے باہر نکل آئے۔ دوسرے روز جنت کالج نہیں گئی، کمرے میں بند رہی۔ شام کو جب ابا مغرب کی نماز سے فارغ ہوئے تو نہایت متانت سے جنت اپنے باپ کے پاس پہنچی۔ اس کی ماں اور دادی کو احساس تھا کہ لڑکی کوئی ہنگامہ کھڑا کرے گی۔ وہ بھی پیچھے پیچھے پہنچ گئیں۔ جنت نے بہت متانت سے گفتگو شروع کی:

''ابا آپ جانتے ہیں کہ میں نماز کی پابند ہوں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ مولوی صاحب نے مجھے قرآن شریف معنوں کے ساتھ پڑھایا ہے۔ ایک خاتون کی حیثیت سے میں اپنے حقوق جانتی ہوں۔ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر منگنی ٹوٹ گئی تو خاندان کی عزت مٹی میں مل جائے گی۔ آپ کے خاندان کی موجودہ عزت ہے کیا؟ عزت بنانے کی تو میں کوشش کر رہی ہوں۔ آپ مجھے پڑھنے دیں، منگنی توڑ دیں''۔ شہاب الدین کے آنسو بہنے لگے۔ بے قرار ہو کر بیٹی کو گلے سے لگا لیا۔

دادی اماں: ''اے ہے۔ ارے دیکھو تو اس چھنال کو، کیا زبان درازی کر رہی ہے۔ میں اس کی چٹیا پکڑ کر زمین پر رگڑ دوں گی۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ میں نے بول دیے ہیں۔ منگنی نہیں ٹوٹ سکتی۔ اس کی شادی واجد سے ہو گی اور جلدی ہو گی۔ میں آج ہی خدیجہ

سے تاریخ لیتی ہوں۔

جنت: ''ابا! میرے الفاظ یاد رکھئے گا۔ میں ذہنی طور پر اور جسمانی طور پر شادی کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں آپ کے خاندان کی عزت ہوں، مجھے مجبور نہ کیجئے گا کہ میں آپ کے خاندان کی بدنامی کا باعث بنوں''۔ یہ کہہ کر جنت واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شہاب الدین جانتے تھے کہ انکی بیٹی قدرت کا شاہکار تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بچی ابھی ذہنی طور پر اور شاید جسمانی طور پر ازدواجی زندگی کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ ایسا انمول ہیرہ تھی جس کو سنبھالنا ان کے خاندان کے لئے مشکل لگ رہا تھا۔ وہ خود ذاتی طور پر اپنی اکلوتی بیٹی کو اس کا تعلیمی حق دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہمت کر کے اپنی ماں اور اپنی اہلیہ کو بلایا اور جنت کی منگنی توڑنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

جنت کی ماں: ''دیکھئے ایک نہ ایک دن اس کی شادی تو کرنی ہے۔ بچی پر ابھی الزام کم ہیں۔ بعد میں الزامات اتنے زیادہ ہو جائیں گے کہ وہ اور ہم لوگ دب کر رہ جائیں گے۔ وہ بُرا ہوگا، عمر بھر شادی نہ کر سکے گی۔''

دادی اماں: ''شہاب الدین تمہیں اس کی تعلیم کی فکر ہے نا۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ اے میں خدیجہ سے کہہ دوں گی کہ بچی شادی کے بعد تعلیم جاری رکھے گی۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ لڑکی کا خصم ہو تو کوئی بدنام نہیں کر سکتا۔ لڑکا سب کا منہہ بند کر دے گا اور بیوی کو تعلیم دلواتا رہے گا۔ سمجھے نہیں سمجھے۔''

شہاب الدین: ''دیکھئے رابعہ بیگم۔ اس معاملے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ہمیں ایک ہفتے تک خاموشی اختیار کر لینی چاہیے۔ کوئی جنت سے بات نہیں کرے گا۔ اماں جی، آپ اس معاملہ کو خراب نہ کریں۔ جنت سے بات نہ کریں، خاموش رہیں۔''

دادی اماں: ''اے ہے! میرا منہہ تو شاہ وقت بھی بند نہیں کر سکتا۔ حق پر ہوں، حق مانگتی ہوں، تجربہ کار ہوں۔''

ایک ہفتہ گزر گیا۔ جنت نے اپنے آپ کو کمرے میں مقید رکھا۔ نہ کالج گئی اور نہ ہی گھر کی خبر لی۔ گھر کا گوشہ گوشہ فریادی معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس آواز کو ڈھونڈ رہا تھا جو کبھی ٹل ٹل مینا سے مشابہ تھا۔ وہ محرابیں جن میں کھیل کھیل کر یہ بچی جوان ہوئی تھی، آج سوگوار اس کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کی کتابیں اس کو تعجب سے، تاسف سے دیکھ رہی تھیں کہ انکے ورق گردانے والی کہاں تھی۔ وہ ہونٹ جن سے خوشی کے دھارے نکلتے تھے آج آنکھوں سے بہتے آنسوؤں سے نم تھے۔ ایک تاریک سے ویران کاشانے میں دیئے بُجھ چکے تھے۔ اس کمرے کے طاق و در و بام رو رہے تھے۔ جیسے قبرستان میں ایک زندہ لاش پڑی ہو۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، ''بیٹی جنت'' وہ سمجھ گئی کہ باپ کچھ فریاد کرنے آیا ہے۔'' آیئے ابا''۔

''بیٹی مجھ سے تیری حالت نہیں دیکھی جا رہی۔ مجھے احساس ہے کہ تو کس آگ میں جل رہی ہے۔ کب تک جلے گی۔ زندگی میں ایسے دور آتے ہیں کہ زہر کے گھونٹ پی کر کچھ فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ بیٹی تعلیم کے بعد بھی تو تجھ کو شادی کرنی ہے نا۔ کسی کا گھر تو تجھ کو بسانا ہے نا۔ ہمارا کہنا مان لے گی تو ہماری اور تیری عزت رہ جائے گی۔ ہم سب تیری ہر طرح سے مدد کریں گے۔ تجھے پڑھنے کا شوق ہے نا؟ شادی کے بعد اپنی تعلیم جاری رکھیو۔ میں اس کا وعدہ کرتا ہوں۔ مومن صاحب کبھی میری بات کو رد نہیں کریں گے۔ شادی کے بعد تیری تعلیم جاری رہے گی۔''

جنت نے صرف اتنا کہا ''ابا۔ جنت کو دوزخ میں نہ ڈالیئے۔''

جنت کی کالج سے غیر حاضری کی خبر اس کی سہیلیوں کو پہنچی۔ وہ مارلین ولسن کی قیادت میں جنت سے ملنے آئیں اور صورتِ حال معلوم کر کے انہوں نے جنت کے باپ سے براہِ راست گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا اور شہاب الدین کے دفتر سے واپسی کا انتظار کرنے بیٹھ گئیں۔ ان کے آنے پر گفتگو شروع ہوئی۔

Marlene Wilson: Uncle we know about your plan for Jannat's future. We all have grown up with Jannat. We know Jannat better than you do. Jannat is very strong willed girl. Nobody can change her mind. If you marry her against her will, you will face dire consequences. She may obey you because you are her father, but after marriage, you will have no control on her. She may go to any extent. We warn you. Please reconsider your decision.

Shahabuddin: Thank you Marlene, I know what you mean.

دادی اماں: ''اے شہاب الدین۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ یہ گوری کیا گٹ پٹ کر رہی تھی۔ اے یہ کچھ نہ کچھ زہر اُگل کر گئی ہوگی۔ دوغلی کہیں کی۔ نہ انگریزوں کی نہ ہندوستانیوں کی۔ اس ہی نے میری بچی کو باغی بنایا ہے۔ موئی، مردار، گوری چمڑی، چھلا شلغم۔ پھٹکار پڑے اس پر۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ اس کو تو ڈھائی گھڑی کی آئے تو میں سانس لوں۔ میری گوڑی جنت کو اسی نے بگاڑا ہے۔ مردار، نامراد، کنجری کہیں کی۔ سمجھے نہیں سمجھے، شہاب الدین۔''

رسومات پارینہ کی فرسودہ جڑیں، ابھرتی ہوئی ایک کونپل کو مسل رہی تھیں۔ جھوٹے وعدوں، جھوٹی انا کا سہارہ لے کر جنت کے ماں باپ بند کمرے میں آئے اور شادی کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔ جنت کے منہ سے صرف یہ نکلا کہ ابا آپ نے بُرا کیا۔

ایک ہفتے بعد، بند کمرے میں، والدین ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ موکل نے جنت کی شادی واجد علی خاں سے بعوض پانچ ہزار روپے مؤجل کا اعلان کیا۔ دادی اماں نے جنت کے سر کو ٹھیکا دیا اور جنت، واجد علی خاں کے نکاح میں چلی گئی۔ شادی نہایت خاموشی سے ہوئی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ جنت کو اس کے سسرال وداع کر دیا گیا۔ دادی اماں بہت خوش تھیں کہ ان کے دئے ہوئے بول پورے ہوئے۔ جنت کی ماں

خاموش تھیں کہ ان کی بیٹی انکی بہن کے گھر بیاہ کر گئی۔ جنت کے باپ آسماں کی طرف دیکھتے رہے اور صرف یہ الفاظ ان کے منہ سے نکلے" اللہ رحم کرے۔"

جنت دلہن بنی، لیکن نام کی۔ جیسے کسی نے لال جوڑا پہنا کر کسی پارٹی میں بھیجا ہو۔ اس لالہ رُخ کی رنگت میں شادی کی بجائے۔ مُردنی نمایاں تھی۔ جیسے ایک غنچۂ ناشگفتہ کو شاخ سے کاٹ کر زمین پر پھینک دیا ہو۔ رات کو اس نے اپنے شوہر کو ایسا عجیب الخلقت عجوبہ پایا جو بات بات پر مردانہ وار کرتا تھا، مگر وہ مرد نہ تھا نہ عورت۔ پنجرے میں ایک بلبل بند تھی اور اس میں ایک چوہا گھس آیا تھا۔ وہ اپنے بچاؤ میں پھڑ پھڑا رہی تھی کہ صبح ہوگئی۔

جنت ایک باہمت اور ہوشمند لڑکی تھی، لیکن پچھلے چوبیس گھنٹوں کے طوفان کے بعد بجلی گری تھی جس سے وہ ایسی پاش پاش ہوئی کہ وہ اپنے ٹکڑے اُٹھا کر اپنے آپ کو جوڑ نہ پا رہی تھی۔ اس نے پہلا قدم یہ اُٹھایا کہ گھونگٹ نکالنا شروع کر دیا تا کہ چہرے کے تاثرات دوسروں پر عیاں نہ ہوں اور پنجرے میں سے نکلنے کا اور چوہے کو بھگانے کا عمل سوچتی رہتی۔

شادی کو ابھی چندرہ دن ہی گزرے تھے کہ واجد اپنی اماں کے پاس کچھ پریشانی کی کیفیت میں پہنچے اور خبر دی کہ جنت کالج میں اپنی تعلیم شروع کرنا چاہتی ہیں۔ یہ سُن کر وہ سیخ پا ہوگئیں، اور بھاگی بھاگی جنت کے پاس پہنچیں " دیکھ بیٹی تو آٹھ برس کی تھی تو ہماری ہو چکی تھی۔ تو نے ہمیں بہت انتظار کروایا ہے۔ اب ہم تیری خدمت کریں گے بھی اور کروائیں گے بھی۔ تیرا مستقبل بہت روشن ہے۔ میں نے ایک جوتشی سے فال کھلوائی تھی، اس نے کہا تھا کہ یہ لڑکی ستارے کی مانند چمکے گی۔ تُو بہت خوش قسمت ہے، تیرے ساتھ واجد بھی چمکے گا۔ ہم تیری ہر بات مانیں گے لیکن میری بچی کالج کا نام نہ لیجو۔" یہ جنت کی زندگی کا پہلا زلزلہ تھا۔ لرزتے ہونٹوں اور بھرائی آواز میں جنت

کے منہ سے نکلا "میں خالو جان سے بات کرنا چاہوں گی، اور آج ہی بات کروں گی۔"

"بٹی، شادی کو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور ایسی اکڑ دکھا رہی ہو جیسے گورنر بن کر آئی ہو۔ میرا کہنا کافی نہیں ہے؟"

"خالہ جان، میری شادی صرف اس شرط پر ہوئی تھی کہ میری تعلیم جاری رہے گی۔"

"بھول جاؤ شرطوں کو۔ کالج جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شام کو واجد کے ابا آئیں گے۔ بات کروا دوں گی۔"

مغرب کے نماز کے مومن علی کھانا کھا کر ریڈیو کو ٹیون کر رہے تھے کہ انکی اہلیہ ان کے پاس پہنچی اور اپنی بہو کی تعلیم جاری رکھنے کے ارادے کی اطلاع دی۔ انہوں نے بڑے پیار سے بہو کو بلایا اور سمجھایا۔ "بیٹی مجھے احساس ہے کہ تم ایک روشن دماغ اور نامور طالب علم رہ چکی ہو اور مشہور کالج میں زیرِ تعلیم رہی ہو لیکن اب تم کسی کی زوجۂ نامدار ہو۔ اب مختلف قسم کی ذمہ داریاں تمہارے کندھوں پر ہیں۔ کالج کو بھول جاؤ، گھر لے کر بیٹھو، یہ سب تمہارا ہے۔"

"خالو جان، شادی کی میں نے ایک شرط رکھی تھی اور وہ یہ تھی کہ مجھے اپنی تعلیم پوری کرنیکی اجازت ہوگی۔ ازدواج، حصولِ علم کو نہیں روک سکتا۔"

مومن علی: "ہاں، ہاں ...وہ شہاب الدین نے مجھ سے تعلیم کا ذکر کیا تھا، لیکن بیٹی تم دیکھ رہی ہو کہ کس گھر میں ہو۔ یہ مسلمان گھرانہ ہے۔ سچ پوچھو تو ہم لوگ کافی دقیانوسی ہیں، ہم کیسے اس گھر کی بہو کو عیسائیون کے مشن کالج میں، لڑکوں کے شانہ بشانہ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ ہمارے خاندان کی ناک کٹواؤ گی۔ اور مزید پڑھ کر، کرو گی کیا؟ یہ سب کچھ تمہارا ہے، اپنا گھر سنبھالو۔ میں دوبارہ تعلیم کا نام نہ سنوں۔ عمر کم ہے لیکن زبان خوب چلا لیتی ہو۔"

واجد: "ابا یہ مجھ سے بھی بحث کر رہی تھی۔ اب یہ میری بیوی ہیں، انہیں کالج نہ جانے

دینا۔ ابا... ہاں۔"

جنت نے زلزلے کا دوسرا جھٹکا محسوس کیا، لیکن جنت نے ہمت نہ توڑی۔ وہ اپنے میکے پہنچی اور اپنے باپ سے رو رو کر فریاد کی باپ اپنا وعدہ پورا کرے اور اپنے دوست، اپنے ہمزلف اور اپنے سمدھی سے ضد کریں کہ جنت کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔ شہاب الدین اپنی بیٹی کی طرف داری کرنے کے لئے اپنے سمدھی کے پاس پہنچے اور جنت کی قابلیت کا احساس دلایا اور اس کی بے باکی اور ضد کا خدشہ بھی سنایا۔ اسم بامسمّٰی مومن نے اسلام کا سہارہ لیا اور مسلمان گھرانے کی بہو کو عیسائیوں کے کالج یا کسی اور کالج میں لڑکوں کے ساتھ مزید تعلیم حاصل کرنا فضول اور بے معنی سمجھا۔ انہوں نے جنت کے والد کو یہ بھی واضح طور پر تنبیہ کردی کہ دوبارہ اس مسئلہ کو زیرِ بحث نہ لایا جائے۔ یہ جنت کا تیسرا زلزلہ تھا۔

جنت کی شادی ہو چکی تھی لیکن اس نے نفسیاتی اور جسمانی طور پر اپنے ازدواج کو قبول ہی نہ کیا تھا۔ وہ اس منزل پر ابھی تک نہیں پہنچی تھی جہاں ایک صنفِ نازک اپنے مدِ مقابل کسی فاعل کو ڈھونڈتی ہے۔ اس کے لئے اس کی شادی، اس کے خاندان کی ضد اور چپقلش کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ حقیقت میں یہ چنچل وہ معنی ہی نہ سمجھی تھی جو "شادی" کے لفظ میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس کے لئے واجد علی خاں، اسکی خالہ کا ایک بے وقوف سا لڑکا تھا جس کی احمقانہ حرکتیں وہ بچپن سے دیکھتی چلی آئی تھی۔ اس نے لڑکے کو زبان سے یا دل سے یا دماغ سے یا جسم سے شوہر کے طور پر قبول نہ کیا تھا۔ جنت کے لئے واجد سے شوہر کا رشتہ بے معنی اور ناقابلِ قبول ثابت ہو رہا تھا۔

اس ہوشمند لڑکی نے حالات سے سمجھوتا کر کے اپنی تعلیم کی پھر بھیک مانگی۔ اس نے اپنے شوہر سے التجا کی کہ وہ بھی اعلیٰ تعلیم جاری رکھے اور اپنی بیوی کو بھی کالج میں پڑھنے کی اجازت دے۔ انسان صرف علم سے ترقی کرتا ہے" علم حاصل کرنے کے لئے

ہم دونوں کو جوانی سے فائدہ اٹھانا چاہیئے''۔ واجد نے صاف صاف لفظوں میں اپنا فیصلہ سنا دیا'' دیکھئے جنت! پڑھنا وڑھنا میرے بس کا نہیں، بڑی مشکل سے بی.اے. کیا ہے۔ ابا کو دعا دیتا ہوں کہ نوکری مل گئی ورنہ آجکل تھرڈ ڈویژن کو کون پوچھتا ہے۔ آئندہ مجھ سے تعلیم کا ذکر نہ کیجئے گا اور نہ میں آپ کو پڑھنے دوں گا۔ آیئے کچھ اور باتیں کریں''

جنت اب بہت مایوس ہو چکی تھی۔ وہ اپنا نیا ماحول ذہنی طور پر قبول کرنے پر کسی قیمت میں آمادہ نہ ہو رہی تھی۔ اس کو اس ماحول سے فرار چاہیئے تھا یا پھر موت۔ نہایت پریشان دماغی کیفیت میں اس نے اپنی دو راز دار اور وفادار سہیلیوں کو بلایا۔ انگلو انڈین مارلین اور ہمسائی ماہ نور سے پوری صورت حال پر دل کھول کر بحث ہوئی۔ سہیلیوں نے امید ظاہر کی کہ وہ واجد سے ملکر اس کو راضی کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

شام کو یہ دونوں لڑکیاں آئیں اور واجد سے بات کی، جو زیادہ دیر نہ چلی۔ لڑکیوں کی شکل دیکھ کر ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ گفتگو کا عنوان کیا ہوگا۔ بہت جاہلانہ انداز میں فیصلہ سُنا دیا، ''کبھی نہیں، کبھی نہیں۔ کبھی ایسا نہ ہونے دوں گا۔ بتا دو اپنی سہیلی کو جو اپنے آپ کو جنت کہتی ہے اور میرے واسطے دوزخ بن کر آئی ہے۔''

مارلین اور ماہ نور جنت کو روتا چھوڑ کر واپس چلی گئیں۔ یہ جنت پر پانچواں زلزلہ تھا۔

جنت کا سسرال ایک قید خانہ تھا۔ اس گھرانے میں وقت رُکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ گھریلو ماحول میں یا معمول میں برسوں سے کسی قسم کی تبدیلی نہ آنے پائی تھی۔ صاحب خانہ، مومن صاحب کو ابھی تک ٹائی باندھنی نہ آئی تھی۔ جب ٹائی کئی سال پرانی ہو جاتی تو وہ اپنے عزیز دوست کمال پاشا سے نئی ٹائی خرید وا کر اس میں گرہ لگوا لیتے تھے۔ صبح کو روزانہ مرغیوں سے خوش ہونا ان کی واحد ہوبی تھی۔ کوئی مشکل پیش آجائے تو نیاز

دے دی جاتی تھی۔ دادی اماں کا کہنا اس گھر میں بھی حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ دادی اماں تاکید کرتی رہتیں تھیں کہ سب داستانِ امیر حمزہ پر نہ صرف یقین رکھیں بلکہ باعثِ ثواب سمجھیں۔ اس گھر میں شب برات کی رات، مٹکوں کی چپنیاں ضرور کھول دی جاتی تھیں تا کہ مُردوں کی روحیں جب پانی پینے آئیں تو انہیں دقت نہ ہو۔ کبھی کبھی بُرائی کانفرنس بھی ہو جاتی جس میں ہر جاننے والے کی ہر بُرائی کو زیرِ بحث لایا جاتا تھا۔ کبھی منہ کا مزہ بدلنے کے لئے کسی پر الزام بھی تراشا جاتا کارِ خیر سمجھا جاتا تھا۔

آج کا مہورت بارنگِ دگر تھا۔ واجد اپنی اماں کے پاس بڑے لاڈ و پیار سے پہنچے اور ایک فتنے کا آغاز کیا۔ ''اماں بی... اماں بی، اگلی تنخواہ ملے گی نا مجھے تو میں آپ کو بُندے بنوا کر دوں گا۔'' ''اے بیٹا جنت کو بنوا کر دینا۔ میری عمر بُندے پہننے کی ختم ہو گئی ہے''۔ ''نہیں اماں نہیں۔ معلوم.... معلوم آپ کو۔ جنت اچھی لڑکی نہیں۔ اس کو کبھی کالج نہ جانے دینا۔ معلوم... معلوم آپ کو کل اس کی سہیلیاں آئیں تھیں نا۔ مجھ سے ملیں تھیں نا۔ وہ ایک انگریز تھی اور دوسری ماہ نور تھی نا۔ اماں، معلوم وہ کیا کہہ رہی تھیں، وہ کہہ رہی تھیں کہ جنت ٹھیک نہیں۔ جنت کے کالج میں ایک لڑکے سے تعلقات تھے۔ جبھی تو اس نے کالج کی ضد لگا رکھی ہے۔ معلوم اماں...اسے کبھی کالج نہ جانے دینا۔ اماں ہاں۔''

ہونٹوں کی بات کوٹھوں چڑھی۔ میکے سے بلاوہ آیا اور جنت کو ماں باپ کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ پیکرِ معصومیت، جس کی روشن دماغی کا یہ عالم تھا کہ آنکھوں آنکھوں میں اپنے متکلم کے دل کی بات سمجھ لیتی تھی۔ سعادتمند ایسی کہ ماں باپ کی خاطر جان دیدے، مجسم پارسا، ہمہ تن عصمت، حاضر جواب، بے باک۔ بدیہہ گو ایسی کہ سامعین ہکا بکا رہ جائیں۔ آج اپنے باپ کے سامنے ایک گھٹیا اور جھوٹے الزام کی خاطر پتھر کی پتلی بنی کھڑی تھی۔ آنسوؤں کی قطار میں باہمت لڑکی نے ایک لفظ منہ سے نہ نکالا۔ جب

الزام لگا لگا کر سب خاموش ہو گئے تو چلتے چلتے صرف اتنا کہا ''ابا! اللہ پاک کی قسم میں آبِ زمزم کی طرح پاک ہوں۔ مجھ پر غلط الزام لگایا گیا ہے، میری سہیلیوں سے پوچھ لیجیے۔''

جنت روتی ہوئی اپنے سسرال پہنچی۔ وہاں سب کا موڈ خراب تھا۔ حسب معمول مغرب کی نماز کے بعد کھانا نہ کھایا۔ سب خاموشی سے ایک دوسرے سے نگاہیں چُرا رہے تھے۔ جنت کوئی بات کرتی تو جواب نہ ملتا۔ آخر کار مومن علی خاں نے اپنے بیٹے اور جنت کو بلایا۔ گھر کی فضا چیخ چیخ کر پکار رہی تھی کہ آج کوئی سوئے دار جا رہا تھا۔ کسی کو سولی چڑھے گی۔ مومن علی نے بڑے بھونڈے طریقہ سے گفتگو شروع کی'' کون تھا وہ لڑکا؟''

جنت: ''کس لڑکے کی بات کر رہے ہیں آپ؟''

مومن: ''وہی کالج کا لڑکا''

جنت: ''میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتی ہوں کہ میں اس قسم کی غلط الزام تراشی کو برداشت نہ کروں گی۔ جایئے کالج کے اسٹاف، لڑکوں اور میری سہیلیوں سے پوچھ لیجیے''

واجد کی والدہ: ''اے لو... کیا زبان دراز لڑکی ہے۔ اس کی زبان تو میں بند کروں گی۔ اس کی چٹیا زمین پر نہ رگڑوں تو میرا نام خدیجہ بیگم نہیں۔ حرام خور، آوارہ، کنجری، ہمارے خاندان کا منہ کالا کر دیا اور اب زبان درازی کرتی ہے۔ کس کس سے منہ کالا کروایا تو نے؟''

خود کشی

ترکمان دروازے کے سامنے، میر درد روڈ پر جنت نے جنم لیا تھا۔ وہاں سے تقریباً ۵۰۰ گز کے فاصلے پر ایک ریلوے پُل ہے۔ انگریزوں کا بنایا ہوا یہ پُل نئی دہلی کو دریا گنج اور قرولباغ سے ملاتا ہے۔ اس پل کے عین نیچے نئی دہلی کا ریلوے سٹیشن واقع ہے۔ دہلی آنے والی اور جانے والی ریل گاڑیاں اس پل کے نیچے سے گزرتی ہیں۔ تقریباً بیس ریل کی پٹڑیاں اس پل کی چار محرابوں میں سے گزر کر ہی اپنی منازل کو پہنچ سکتی ہیں۔ پل کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے برٹش راج نے اس پل کو اونچا وسیع اور خوبصورت بنایا ہے۔ اس کے اوپر دو رویہ ٹریفک پوری کشادگی کے ساتھ چل سکتا ہے۔ پل کے اوپر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دونوں طرف چوڑے فٹ پاتھ بنے ہوئے ہیں اور حفاظت کے لئے اونچی اور خوبصورت منڈیر بنی ہوئی ہے۔ یہ منڈیر کوئی پانچ فٹ اونچی ہوگی۔ اس پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر خوبصورت بجلی کی لائٹیں لگی ہوئی ہیں۔ اگر اس پل کی باؤنڈری وال سے کوئی چیز گرے تو وہ ریل کی پٹڑیوں پر جا کر گرے گی۔

ایک دن M.Sc. کا امتحان دینے کے بعد مومن علی خان کے ہمسائے کا بیٹا

رضوان خاں، کالج سے کچھ ریسرچ کے کاغذات لے کر سائیکل پر پل پر سے گزر رہا تھا تو کیا دیکھتا ہے کہ ٹریفک بند ہے اور پل کی منڈیر پر ایک لڑکی کھڑی ہوئی ہے اور غل مچ رہا ہے ''لڑکی خودکشی کر رہی ہے، پولیس... پولیس کو بلاؤ۔'' اور لڑکی ایک خوفزدہ شیرنی کی مانند چیخ رہی ہے ''خبردار! کوئی میرے پاس آیا۔ میں کود جاؤں گی''۔ اگر کوئی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتا تو لڑکی زور سے چیختی۔ رضوان یہ تماشا دیکھنے کے لئے سائکل سے اُترا اور غور سے لڑکی کو دیکھا اور دیکھ کر حیران رہ گیا... یہ تو جنت تھی۔ اس نے سائیکل پھینکی اور لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا منڈیر کے پاس پہنچ گیا۔

رضوان: ''یہ کیا حرکت ہے جنت! تمہارا دوپٹہ کہاں ہے؟''

جنت کی غصے میں آنکھیں لال تھیں، منہ سے تھوک بہہ رہا تھا، انگلیاں شیرنی کے ناخنوں کی طرح اکڑی ہوئی تھیں۔

جنت: ''خبردار... رضوان بھائی، میں کود جاؤں گی۔ آج میرا آخری دن ہے، میرے نزدیک آنے کی کوشش نہ کرنا۔''

اتنی دیر میں رضوان دیوار پر چڑھ چکا تھا۔ اس نے اطمینان سے اور مسکراتے ہوئے پوچھا: ''ارے کودنا ہے تو کود کیوں نہیں جاتیں۔ ختم کرو یہ ڈرامہ بازی۔''

جنت!' ریل کو آنے دو پھر کودوں گی کہ میری لاش کے ٹکڑے ہو جائیں''

رضوان آہستہ آہستہ، نیولے کی طرح اپنے پنجوں پر آہستہ آہستہ منڈیر پر سرک رہا تھا۔

رضوان:'' دیکھو جنت، ریل کے آنے میں دیر ہے مگر اس سے پہلے تم کود یں تو ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی مگر مرو گی نہیں۔ ہڈی پسلی جُڑنے کے بعد کیا دوبارہ خودکشی کرنے کے لئے آؤ گی؟'' اور رضوان آگے سرکتا رہا۔

جنت!' میں سر کے بل گروں گی، نہیں بچوں گی جان دے دوں گی آج۔''

رضوان:'' اگر سر کے بل گریں تو شکل نہ پہچانی جائے گی، لوگ بھنگن سمجھ کر تمہاری ارتھی بنا

کر جلا دیں گے'' اور رضوان آہستہ آہستہ اپنے پنجوں پر سرکتا گیا۔

جنت: ''میرے نزدیک نہ آنا رضوان میں وارن کرتی ہوں، مجھے مرنے دو۔ دیکھو تم میرے نزدیک آ رہے ہو، اچھا نہیں کر رہے تم رضوان، میں مروں گی آج... آج، ابھی۔''

رضوان: ''میں نزدیک نہیں آ رہا! میں تو ریل کو دیکھ رہا تھا، جب ریل آئے گی تو میں تم کو سگنل دوں گا... جنت کودو... تم کود جانا'' اور رضوان آگے آگے سرکتا رہا۔

جنت: ''میری زندگی کا آخری سین دیکھ لو، سب کو بتا دینا۔ اس ہجڑے کو بھی بتانا جو اپنے آپ کو شوہر کہتا ہے... رضوان''

رضوان: ''ریل دوسری پٹڑی پر آنے والی ہے۔ آؤ میں تمہیں صحیح پٹڑی پر کھڑا کر دوں'' یہ کہہ کر رضوان نے جپ لگائی اور جنت کی کمر اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر اس کو فٹ پاتھ پر گرا لیا۔ لڑکی نے چیخنا شروع کیا... رونا شروع کیا اور پھر بے حس ہو گئی۔ اس کے سر پر چوٹ آئی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ راہ گیر جمع ہو گئے اور سوال و جواب شروع ہوئے۔ طرح طرح کے سوال پوچھے گئے۔ اس لڑکی کو آپ جانتے ہیں؟ آپ کی کون ہوتی ہے؟ پولیس کو بلائیں؟

رضوان نے تفصیلات میں بتایا کہ لڑکی شادی شدہ ہے اور اس کا تعلق ایک بہت ہی نیک خاندان سے ہے۔ کسی دماغی پریشانی کی وجہ سے اس نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ جلد از جلد اس کو اسکے گھر پہنچانا لازم ہے۔ چونکہ معاملہ بہت شریف گھرانے کا تھا، پولیس میں رپورٹ کرانا نہایت بدنامی کا باعث ہوگا۔ خاموشی سے لڑکی کو اس کے گھر پہنچانے میں ہی مصلحت سمجھی گئی۔ رضوان نے راہگیروں کی مدد کے ساتھ لڑکی کے ماتھے کے زخم پر پٹی باندھی، اس کو تانگے میں بٹھایا اور درخواست کی کہ راہگیر جنت کو چھوڑنے اس کے گھر تک چلیں۔ گھر زیادہ دور نہ تھا۔

جب تانگہ مومن علی کے گھر پہنچا تو دروازے پر کہرام مچا ہوا تھا۔ عورتیں ماتم

کر رہی تھیں۔ مرد سب دفتر گئے ہوئے تھے۔ بے ہوش جنت کو دیکھ کر عورتیں سمجھیں کہ جنت کی لاش آئی ہے۔ جنت کی ساس نے رضوان کو وہ رقعہ دکھایا جس پر جنت کے ہاتھ کی وصیت لکھی تھی۔ اس میں تاکید کی گئی تھی کہ اس کی کتابیں یتیم خانے میں دے دی جائیں۔ جب رقعہ برآمد ہوا تھا اس وقت تک تمام مرد دفتر جا چکے تھے۔ جنت کی ساس اور ہمسائے کی عورتیں دماغی طور پر مفلوج ہو کر مہمل جملے بک کر سینہ کوبی کر رہی تھیں۔ سراسیمگی کی حالت میں رضوان نے جنت کو کمرے میں لٹایا اور حادثہ کی خبر دینے کے لئے لڑکی کے شوہر کے دفتر پہنچے۔ تھوڑی ہی دیر میں واجد اپنے والد مومن علی خاں کو لے کر گھر پر آموجود ہوئے۔ اس وقت تک جنت ہوش میں آ چکی تھی۔

خودکشی کے بھی ہزاروں طریقے ہیں۔ لوگ خودکشی کرتے ہیں، کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔ خواب آور گولیوں کی شیشی اپنے منہ میں انڈیل کر سو گئے اور سوتے کے سوتے ہی رہ گئے۔ صبح ہارٹ اٹیک کا سہارا لے کر رشتے دار دفنا دیتے، کتنی پرسکون اور کامیاب خودکشی ہوتی یا جمنا میں کود پڑتی تو رشتے دار جمنا کی لہروں پر الزام لگا دیتے۔ اور بھی آسان یہ تھا کہ تار ہاتھ پر باندھ لیتی اور اس کا دوسرا سرا بجلی کے سرکٹ میں پھنسا کر اون کر دیتی۔ الزام بجلی کی وائیرنگ پر لگا کر چپکے سے دفنا دیا جاتا۔ مرنے والا بھی خوش اور گھر والے بھی خوش ہوتے کہ جان چھوٹی۔

جنت کی سر بازار خودکشی کی ترکیب سے اس کا خاندان بہت نالاں تھا۔ اونچی منڈیر پر ایک نوجوان مسلمان لڑکی کا ہجوم کے سامنے کھڑا ہونا اور وہ بھی بغیر برقع کے کھڑا ہونا۔ اور تو اور بغیر دوپٹہ کے کھڑا ہونا، مناسب نہ تھا۔ اور اس ہنگامہ آرائی کے باوجود خودکشی کامیاب نہ ہوئی۔ یہ اور بھی ذلت کا مقام تھا۔ مومن علی کی عزت، خاندان کی عزت، سب کچھ خاک میں مل گئی تھی۔ اس ناکامیابی پر کسی کو سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس لڑکی کا اب کیا کیا جائے۔ کمبخت نے بدنام بھی کیا اور مری بھی نہیں۔ مومن بار بار

دانت پیس پیس کر اس کی طرف بڑھتے اور ہانپتے کانپتے واپس ہوتے۔ جب کچھ نہ کر سکے تو انہوں نے لڑکی کے والدین کو بلایا کہ وہ حد درجہ ہنگامی حالت میں اپنی بیٹی سے ملنے آ جائیں۔ شہاب الدین اپنی بیوی کے ساتھ مومن علی کے گھر پہنچے۔ پیچھے پیچھے دادی اماں بھی جوتی چٹخاتی آن موجود ہوئیں اور آتے ہی انہوں نے اعلان کر دیا کہ لڑکی کا پیر بھاری تھا اور کچھ اونچ نیچ ہوئی ہے۔ پھر پوچھا کہ سر پر پٹی کیوں باندھی گئی ہے۔

مومن علی کے تیور دیکھ کر سب لوگ سنجیدہ ہوئے اور انہوں نے نہایت فحش زبان اور مبالغہ آمیز الفاظ میں جنت کے کرتوت بیان کئے۔ جنت نے اپنے جرم کا اقرار اپنی خاموشی سے کیا۔ روتی گئی اور ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے ماں باپ کو دیکھتی رہی۔ منہ سے صرف یہ نکلا: ''مجھے جرم کا اقرار ہے، مجھے سزا دی جائے۔''

جنت کی سزا کا اعلان بہت مشکل تھا، اور مومن علی کا ردِ عمل بہت جابلانہ تھا۔ انہوں نے عتاب میں آکر اس کو اپنے گھر کے ایک کونے میں قید کرنے کا حکم سنایا اور کہا کہ یہ قید تا حکمِ ثانی جاری رہے گی۔ شہاب الدین نے، انکی بیوی نے اور جنت نے اپنے آپ کو اتنا بے بس پہلے کبھی نہ پایا تھا۔ اب رشتہ سمدھیانے کا نہ رہا تھا، اب معاملہ ظالم اور مظلوم کا رہ گیا تھا۔ شہاب الدین نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا، سکتے میں آئی ہوئی اپنی اماں کو سہارا دیا اور مومن علی کا گھر چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ صرف اتنا منہ سے نکلا "بیٹی میں بڑا مجبور ہوں، اللہ تیری مدد کرے۔"

شہاب الدین کے جانے کے بعد جنت کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ برابر کی کوٹھڑی میں رفع حاجات کے لئے ایک لکڑی کا کموڈ رکھا گیا اور کمرے کے دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہ تھی، ہاں اوپر ایک روشندان تھا جو ایک عرصے سے بند پڑا تھا۔ سوائے ایک پلنگ کے کوئی فرنیچر نہ تھا۔ جنت پلنگ پر لیٹ گئی۔ اب یہ ایک ایسی زندہ لاش تھی جس کو موت نے بھی قبول نہ کیا تھا۔ وہ لیٹی رہی۔ مکڑی کے جالوں کو دیکھتی رہی، ویران چھت کو گھورتی رہی۔ وقت رُک چکا تھا، کاٹے نہ کٹتا تھا۔

کروٹ بدلی، دیوار پر ایک چھپکلی نظر آئی۔ جنت نے فریاد کی وہ اپنا زہر مستعار دیدے، لیکن وہ بھی رینگتے رینگتے غائب ہوگئی۔ ایسا وقت آن پڑا تھا کہ نہ انسان اس کی بات سمجھتے تھے اور نہ ہی جانور اس کی بات مانتے تھے۔

پنجرے میں ایک بلبل بند ہوتی تو کم از کم ہوا میں سانس تو لے سکتی تھی، بادِ صبا کا جھونکا نہ سہی۔ اس گلاب کی کلی کے اوپر تو فولادی خول ڈھک دیا گیا تھا کہ اب اس کو صرف کملا کر خاک ہونا تھا۔ دن کو رات کی سی تاریکی ہوتی۔ اوپر روشن دان سے سورج کی ایک کرن تھوڑی دیر کے لئے اندر آتی اور کمرے میں اُڑتے ہوئے ذرّات کو روشن کر کے مژدہ سناتی کہ دیکھ یہ ذرّے اللہ کی کائنات ہیں۔ ہر ذرّے میں دُنیا ئیں بسی ہوئی ہیں۔ ان کے باسی آج جنت کو دیکھ رہے تھے۔ یہی ذرّات تیری غربت کی شہادت دیں گے۔ جنت کے منہ سے قرآن شریف کے الفاظ نکلے جن کے معنی ہیں ''مجھ کو مٹی بنایا ہوتا''۔ کرن سرکتے سرکتے غائب ہوگئی۔ جنت اس کرن کا بے چینی سے انتظار کیا کرتی کہ کب دوسرا دن آئے گا اور ذرّات کے باسی اس کی قید کے شاہد ہوں گے۔ اس قید میں جنت دن کو سونہ سکتی اور رات کو جاگتی رہتی۔ رات کو روشن دان پر نظر رکھتی کہ شاید آسمان نظر آئے۔ شاید کوئی ستارہ جھانکے۔ بے خوابی سے اس کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ تیسرا دن تھا کہ ایک ہوا کا جھونکا آیا اور روشندان پر دستک ہوئی۔ وہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔ روشندان کی جھری میں سے ایک ستارہ چمک رہا تھا۔ اس نے ستارے کو غور سے دیکھا اور با آواز بلند کہا ''اللہ .... اللہ، تیرے حضور میں ایک سجدہ، دلاتا ہے ہزار غلامی سے نجات۔ میں جس حالت میں بھی ہوں، تجھے سجدہ کرتی ہوں۔ مجھے اس قید سے، مجھے اس غلامی سے، نجات دلا دے۔'' اور یہ کہہ کر سجدے میں گر پڑی۔ ابھی سجدے ہی میں تھی کہ پھر ہوا کا جھونکا آیا، پھر دستک ہوئی۔ آواز آئی، جنت رات گزر چکی ہے۔ صبح ہونے کو ہے۔ دل سے کہو کہ نہ گھبرائے۔ جنت سجدے سے

اُٹھی۔ کچھ بے خودی کے عالم میں اُٹھی اور پھر ستارے کی طرف دیکھا۔ ستارہ جا چکا تھا اور چھت پر ایک ہوائی جہاز کا وہم سا نظر آیا۔ گھبرا کر دروازے کی طرف بھاگی، اوپر سے چھپکلی گری اور جنت کے گھنے بالوں میں اُلجھ گئی۔ اس نے اس کو انگلیوں سے پکڑا اور پوچھا ''کیا تو بھی آج میری فرمائش پوری کرنے آئی ہے؟''

دوسرے دن ناشتہ نہ دیا گیا۔ تالا کھولا گیا اور صاحب خانہ مومن علی خاں ناشتہ لے کر اندر آئے۔ ناشتہ پلنگ پر رکھ کر ارشاد فرمایا، جنت ہم آپ پر ظلم نہیں کرنا چاہتے۔ ہم آپ کو صحیح راستے پر لانا چاہتے ہیں۔ ہم آپ کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ حالات نے ہمارے دماغ کو ماؤف کر دیا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم کیا کریں۔ آپ کو اور ہمیں خود سنجیدہ نصیحت اور مشورے کی ضرورت ہے۔ میں نے اس کا بندوبست کیا ہے۔ ایک ایڈوائزر آج ظہر کی نماز کے بعد یہاں آئیں گے اور آپ سے تخلیہ میں بات کریں گے۔ آپ بالکل نہ شرمائیں، میری عمر کے آدمی ہیں لیکن بہت ماڈرن ہیں اور بہت سلجھے ہوئے انسان ہیں۔ وہ آپ کی پرو بلم کو شاید بہتر طریقے سے سمجھ پائیں۔ ان کا کہنا مان لیجئے گا۔ میرا ان سے تیس سالہ دوستانہ ہے۔ بہت مخلص ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے ٹائی باندھنے کی ٹریننگ دی تھی۔ ان کا نام کمال پاشا ہے۔ وہ آج دوپہر دو بجے آئیں گے۔ خیال رکھئے گا بیٹی۔''

دوپہر دو بجے پھر دستک ہوئی اور جنت کے خسر، صاحب خانہ نے دستک دی، دروازہ کھلا اور مومن صاحب نے کہا ''جنت بیٹی کمال پاشا صاحب آئے ہیں۔ آپ ان سے بات کریں شرمایئے گا نہیں۔'' اور وہ یہ کہہ کر واپس چلے گئے، دروازہ بند نہ کیا بلکہ کواڑ بھیڑ دیئے۔ تھوڑی دیر میں ایک آدمی اندر آیا، ٹی شرٹ میں ملبوس، چھریرا جسم، توانا قد اور مسکراتا ہوا چہرہ۔

کمال پاشا: ''میرا نام کمال پاشا ہے۔ بھئی یہاں تو بڑی گھٹن ہے، کوئی پنکھا نہیں؟

ٹھہریئے میں لاتا ہوں'' یہ کہہ کر وہ باہر گئے اور ایک ٹیبل فین لا کر اس کو چلایا کمرہ بند کیا اور پوچھا، '' آپ کیسی ہیں؟''۔

جنت: ''صورت بہ بیں، حال مپرس''۔

کمال گھبرائے کہ ابتدا بہت مختلف دلیلوں پر سے ہوئی ہے۔

کمال: '' بہت اچھے، جنت! کیا قصہ ہے؟ آپ نے تو ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے''

جنت: '' ٹو دی پوائنٹ بات کروں۔ یا فضول باتوں سے آپ کو ٹال دوں؟''

کمال: '' فضول باتوں کا وقت کس کے پاس ہے، مطلب کی بات کیجئے''

جنت: '' مجھے طلاق چاہیئے''

کمال سکتے میں آ گئے، سر نیچا کیا، سوچنے لگے، پھر پوچھا'' کیا کریں گی آپ طلاق لے کر''

جنت: نئی زندگی شروع کروں گی ...میری عمر سترہ سال ہے۔ میری زندگی ابھی شروع نہیں ہوئی''۔

کمال: '' آپ کی زندگی تو شروع ہو چکی ہے۔ آپ کسی کی بیوی ہیں، کسی کی بہو ہیں، کسی کی بیٹی ہیں۔''

جنت: '' میں اس وقت ننگِ خاندان ہوں، خاندان کی ضد اور انا کا شکار ہوں۔ کسی کی بچپن کی مانگ ہوں، قافلہِ جہالت کی علمبردار ہوں''

کمال: '' باپ رے باپ، آپ تو اچھی خاصی شاعرہ ہیں''

جنت: "Shall we come to the point, I want divorce from my present husband."

کمال: '' آپ طلاق کے بعد کیا کریں گی''

جنت: '' انکل کمال! میں نے کہا نا آپ سے۔ نئی زندگی...نئی زندگی شروع کروں گی۔ پڑھوں گی، علم حاصل کروں گی، دُنیا میں کچھ خدمت کروں گی۔''

کمال نے اس لڑکی کی کم عمری، اس کی بیباکی اور اس کی زندگی سے ٹکراؤ کے انداز پر غور

کیا۔ اس کے علم اور انداز بیاں سے وہ متاثر ہوئے۔ جس سے وہ مخاطب تھے وہ ایک غیر معمولی ہستی تھی۔ بہت سنبھل کر بیٹھے اور گہری سوچ میں پڑ گئے۔

جنت:''اگر آپ میری مدد کو آئے ہیں تو میری نفسیاتی کیفیت کو سمجھ لیں۔ اس کمرے کی قید میرے پروں کو تقویت دے رہی ہے۔ سمندر پار کرنے سے پہلے ضروری ہوتا ہے کہ مرغابی آرام کر لے۔ اپنے بال و پر کو طاقتور ہونے دے۔ انکل کمال سمندر پار جانا آسان نہیں ہوتا۔''

کمال لڑکی کی اپنی صلاحیتوں کے بھروسے پر حیران رہ گئے۔ ان کو گفتگو جاری رکھنے کے لئے الفاظ ڈھونڈنے پڑ رہے تھے۔

کمال:''اگر ایسی بات تھی تو آپ نے شادی کی ہاں کیوں کر دی''

جنت:''کس نے کی؟ میں نے اپنی زبان سے ہاں نہیں کی۔ دادی اماں نے میرا سر ہلایا تھا۔ میں نے نکاح نامے پر دستخط نہیں کئے۔ میں شادی کے لئے ذہنی طور پر تیار ہی نہ تھی، اور وہ بھی اس بے وقوف کے ساتھ؟ اس نامرد کے ساتھ جس کو میں بچپن سے احمق کہتی تھی۔ یہ خاندان نہیں ڈھکوسلا ہے۔

کمال : ''آپ تو اتنی اچھی اردو بول لیتی ہیں۔ ایک بات بتائیے ....کیا میں ایک دوشیزہ سے مخاطب ہوں؟''

جنت:ایسا.....ہی..................سمجھ لیجئے''

کمال: ''آپ دوشیزہ کا مطلب سمجھتی ہیں؟''

جنت:''آپ کا اشارہ بکارت کی طرف ہے۔ میں جواب دے چکی ہوں''

کمال پھر سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ سر چکرانے لگا۔ پھر جنت پر نظر ڈالی۔ جنت کی بھوئیں کمان کی طرح تنی ہوئیں تھیں۔ ان کے نیچے بیضوی آنکھوں میں بڑا ٹھہراؤ تھا۔ پتلیوں میں چمک تھی۔ پہلی بار محسوس ہوا کہ اس کی پتلیوں کا رنگ ہلکا براؤن نہیں بلکہ شربتی تھا۔

آنکھیں بڑی بڑی اور گھنی پلکوں کے بیچ چمک رہی تھیں۔

جنت:

"Uncle Kamal, I am not a psychotic nor a nymphomaniac. But I know what I am. I was born in a wrong house,at the wrong place at a wrong time. I know I am unique. Please get me divorced from this clown."

کمال نے دیکھا کہ جنت کے بال بہت لمبے تھے، پریشان تھے مگر چمکدار، گھنے اور کمر کے نیچے تک لٹک رہے تھے۔ اس کا ماتھا کشادہ تھا۔ اس لڑکی کا نام تو مہ جبین ہونا چاہیے تھا۔ کمال نے اپنی آنکھیں بند کر کے کھولیں۔ جنت کی رنگت گوری نہیں تھی بلکہ سرخ وسفید اور شفاف تھی۔ لالہ رُخ، گل بدن کہنا زیب دیتا تھا۔

کمال: ''جنت، آپ کا قد کتنا ہے؟''

جنت: ''پانچ فٹ سات انچ۔ میرے میاں کا قد پانچ فٹ تین انچ ہے''

کمال: ''آپ کے والدین نے اس لڑکے میں کیا خوبی دیکھی؟''

جنت: ''میں پچپنے کی مانگ تھی۔ کاش میری دادی میرے پیدا ہونے سے پہلے مر چکی ہوتی۔''

کمال: ''طلاق کے بعد دوبارہ شادی کریں گی آپ؟''

جنت: ''پتہ نہیں، اپنی تعلیم کو ضرور پورا کروں گی۔''

کمال:

"Janat, let us get to the point. By any standard you are a very beautiful girl."

آپ گدڑی میں لعل ہیں، جس کی قیمت ابھی تک کسی نے نہ جانی۔

جنت:

"You are digressing from main issue. I want divorce. If divorce is not possible then I want Khulla."

کمال: ''دیکھئے طلاق کے بعد آپ کو شادی تو کرنی پڑے گی۔ شادی کس سے کریں گی''

جنت: ''پتہ نہیں''

کمال نے خریداری نگاہ ڈالی۔ شمشیر زنگ آلودہ تھی مگر بہت جوہر دار تھی۔

کمال: ''میں آپ کی طلاق کا اور مزید پڑھائی کا ذمہ لیتا ہوں۔ میں آپ کی لندن میں پڑھائی کا ذمہ لیتا، لیکن ایک شرط ہے۔''

جنت: ''بولئے۔ شرطیں لگا لگا کر عمر کاٹی ہے، سودا کر لیتے ہیں۔''

کمال: ''آپ کو مجھ سے شادی کرنی پڑے گی۔''

جنت: ''آپ کو احساس ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کمال انکل۔''

کمال: ''ہاں میں آپ سے عمر میں تقریباً تیس سال بڑا ہوں اور میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

جنت: ''مجھے چکر آ رہا ہے۔ ہر چہ در کانِ نمک رفت، نمک شد۔ میں کہیں بے ہوش نہ ہو جاؤں۔''

کمال: ''جنت میری بیوی کا بیس سال پہلے زچگی میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کسی پر دل ہی نہ آیا۔ ہاں آج قتل ہو گیا۔ ٹو دی پوائنٹ بات کرتے ہیں۔ میں آپ کی طلاق کا بندوبست کرتا ہوں۔ آج ہی سے کام کرنے کو تیار ہوں مگر شرط یہ ہے کہ آپ مجھ سے شادی کریں گی اور میں آپ کی تعلیم کا بندوبست انگلینڈ میں کروں گا۔ آپ کو منظور ہے؟''

جنت: ''مجھے سوچنے کا موقع دیا جائے''

کمال: ''میں کل پھر آؤں گا۔''

کمال سیدھے کھڑے ہوئے۔ اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر بال ٹھیک کئے اور جنت کے کمرے سے باہر نکل گئے۔ باہر صاحب خانہ مومن صاحب کمال کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ بے تابی سے پوچھا ''کیا ہوا؟''

کمال: ''ٹھیک ہے۔ بہت ہوشیار بچی ہے، بہت تیز، کچھ زیادہ ہی تیز ہے۔ مجھے کل پھر آنا پڑے گا۔ میں نے نصیحت کی ہے، شاید میری بات مان جائے۔ آپ صرف اتنا کریں کہ اس دماغ میں صرف ایک بات جمادیں کہ اس کو میرا کہنا ماننا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آخر اس مرحلہ کا حل تو نکالنا ہے۔''

کمال پاشا کے جانے کے بعد مومن اپنی بیوی کو لے کر جنت کے کمرے میں گئے اور اس کو سمجھایا: ''بیٹی جنت! ہم تمہارے دشمن نہیں۔ تم ہمارے گھر کی رانی بن کر آئی ہو۔ ہم تمہارے واسطے سب کچھ کریں گے۔ جو کچھ کمال پاشا نے سمجھایا ہے نا بیٹی، بس اس کی بات مان جاؤ۔ وہ بہت سلجھا ہوا انسان ہے۔ سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ بس میری بچی ہمارا کہنا نہیں ماننا چاہتیں تو نہ مانو لیکن کمال کا کہنا مان لو میری بچی۔''

جنت: ''دیکھیے شاید مان ہی جاؤں''

مومن: ''بیٹی! اس کمرے سے باہر نکلو، نہاؤ دھوؤ سنگھار کرو۔ کل کمال پھر آئیں گے''

جنت کے کمرے کے دروازے کھول دیئے گئے۔ جنت اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ روشن دان کی جھری پر نگاہ جمالی۔ کتنی مبارک تھی وہ جھری جس نے شب کی تنہائی میں ستارہ دکھا کر سندیسہ دیا تھا کہ صبح ہونے کو ہے۔ چھت پر ایک ہوائی جہاز کا تخیل، کیا ایک معجزے کی پیشین گوئی تھی، ایک حقیقت کا پیش خیمہ۔ وقت گزر رہا تھا۔ سورج کے جھانکنے کا وقت قریب آرہا تھا۔ وہ بے چین ہو کر اس کرن کا انتظار کرنے لگی جو روشن دان کی جھری سے چپکے سے اندر آ کر کیا کچھ جنت کو سمجھا جاتی تھی۔ چپکے چپکے کرن سرکی اور پھر پوری آب و تاب کے ساتھ کمرہ روشن کر گئی۔ اس کو احساس ہوتا معلوم ہو رہا تھا کہ شاید کوئی اتنے لمبے اور گھنے بالوں کی قدر کرے۔

خاتونِ خانہ، بیگم مومن نے دیکھا کہ جنت بال کھولے اپنی انگلیوں سے کنگھی کر رہی ہے۔ وہ آگ بگولا ہو کر کہنے لگیں: ''جنت یہ بال کیوں کھولے ہیں، شریف

زادیاں بال نہیں کھولتیں''

''خالہ جان کتنے روز سے میں نہائی نہیں ہوں۔ نہانے جا رہی ہوں۔ بال چکٹ رہ گئے ہیں''۔ دوسرے روز ٹھیک دو بجے کمال پاشا پھر آئے اور ان کا مومن علی نے استقبال کیا۔ بہت مختصری گفتگو کے بعد کمال نے جنت کو ایڈوائز کا سیشن شروع کرنے کی اجازت مانگی۔ جنت کو بلایا گیا۔ وہ اپنے پرانے قید خانے میں گئی۔ اس کے پیچھے کمال نے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔

کمال: ''کیسی ہیں آپ؟ کیا بات ہے آج تو آپ کی چٹیا بہت قرینے سے گوندھی ہوئی ہے''

جنت: ''جی ہاں، شیمپو کرنے کی اجازت مل گئی تھی''

کمال: ''کیا سوچا آپ نے میرے پروپوزل کے بارے میں''

جنت: ''بے شک شادی ایک جوا ہے۔ ایک اور جوا کھیل لیتے ہیں۔ آپ نے میری ذہنی حالت دیکھ لی ہے۔ مجھے طلاق چاہیئے۔ اتنا اور بتا دوں کہ میں وعدہ خلاف سے نہ صرف نفرت کرتی ہوں بلکہ بدلہ بھی لیتی ہوں۔''

کمال: ''آپ کو اس کیفیت سے نکال کر میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا۔ جنت! وقت کم ہے اور معاملہ گھمبیر۔ ٹو دی پوائنٹ بات کرتے ہیں۔ میں طلاق کے کاغذات بنوا کر لایا ہوں۔ یہ سارا قانونی گورکھ دھندا ہے۔ آپکی فوراً اپنے شوہر سے جدائی ضروری ہے۔ طلاق کے کاغذ داخل کرنے لازمی ہیں۔ عدت کی مدت پوری ہونے کے بعد شادی کا امکان ہے۔ عدت تین ماہ کی ہوتی ہے۔ آپ تیار ہیں؟''

جنت: ''میں اس جہنم سے، اس قید سے فوراً نکلنا چاہتی ہوں۔ یہ طلاق نہیں ہوگی، یہ خلع ہو گا۔ میں خلع کا حق رکھتی ہوں، اور کورٹ میں جانے کے لئے تیار ہوں۔''

کمال: ''جی ہاں آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ کاغذات پر دستخط کرنے کو تیار ہیں آپ؟''

جنت: ''جی ہاں! میں تیار ہوں''

کمال: ''یہ کاغذات پڑھ لیجئے''۔ کمال نے کاغذ پلنگ پر ڈال دئے۔

جنت نے کاغذات پڑھے، پھر پڑھے...دو آنسو نکلے اور آہ نکلی یا اللہ خیر، مری مدد کیجو

''میں نے کاغذات پڑھ لئے ہیں''

کمال: ''آپ خلع لے رہی ہیں اپنے موجودہ شوہر سے۔ اس قدم کے لئے آپ تیار ہیں؟۔''

جنت: ''جی ہاں میں تیار ہوں''

کمال: ''تو یہاں دستخط کیجئے۔ میں گواہ کے طور پر دستخط کرونگا''

بیس منٹ میں سیشن ختم ہو گیا۔ کمال پاشا کاغذات لئے باہر نکلے جہاں مومن علی اور ان کی زوجۂ نامداران کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

''کہیئے کیا کہتی ہیں ہماری بہو صاحبہ۔ کچھ دماغ زمین پر آیا؟''

کمال: ''اچھی خبر نہیں۔ بُری خبر سننے کی ہمت کر لیجئے۔ یہ لڑکی آپ کے گھر نہیں رہ سکتی۔ اس کو طلاق چاہئے۔ یہ کاغذات دیکھ لیجئے اور سمجھ لیجئے۔ لڑکی کے دستخط موجود ہیں۔ آپ اس کو بلا کر ابھی سارے شک دور کر سکتے ہیں''

مومن: ''ہیں، ہیں، ہیں کیا کہہ رہے ہو کمال۔ پاگل ہو گئے ہو۔ نہیں ہو سکتا، کبھی نہیں ہو سکتا''

بیگم: ''ہائے ہائے ناگن نے یہ کھیل کھیلا ہے۔ میں جا کر اسکی چٹیا زمین پر رگڑ کر اس سے پوچھتی ہوں کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے۔ کمینی، کنجری۔''

کمال: ''دیکھئے میں آپ کو وارن کرتا ہوں کہ میں اس کا وکیل ہوں۔ آپ کوئی بے جا حرکت نہ کریں۔ قانون کی گرفت میں آ گئے تو نکل نہ پائیں گے آپ۔ آپ کا کیس بہت کمزور ہے مومن صاحب۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کی اور آپ کے صاحب زادے

کی مزید بدنامی ہو اور دُنیا آپ کی ہنسی اُڑائے۔ اسلامی اصولوں پر بھی یہ شادی ناجائز ہے۔ واجد میاں اس قابل نہیں کہ وہ حقِ زوجیت ادا کرسکیں۔ ڈاکٹری معائنہ کروایا جا سکتا ہے۔ بہت بدنامی ہوگی۔''

خدیجہ: ''حقِ زوجیت اور کیا مانگتی ہے حرام خور۔ کھانا پینا، سب عیش تو ہم نے اس کو دیے ہیں۔ احسان فراموش، کنجری، نامراد''

مومن: ''چُپ رہو خدیجہ''

مومن علی نے اپنی عینک نکالی اور لرزتے ہاتھوں سے کاغذات پڑھے۔ دوبارہ پڑھے۔ کاغذات ٹائپ شدہ تھے اور ان پر جنت اور کمال پاشا کے دستخط تھے۔ ٹھیک تاریخ ڈالی گئی تھی۔

مومن: ''کمال یہ کاغذات آپ نے ٹائپ کروائے ہیں؟''

کمال: ''جی ہاں! پہلی ملاقات میں جنت کی دماغی کیفیت کو دیکھتے ہوئے اور معاملے کو سمجھتے ہوئے میں نے یہ قدم اُٹھایا ہے۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ اگر یہ قدم نہ اُٹھایا گیا تو کسی کی جان کا خطرہ سامنے تھا۔ دوسری ملاقات میں، میں نے طلاق کے تمام بھیانک پہلو لڑکی کو سمجھا دیے تھے اور لڑکی نے با تمام ہوش وحواس اور معاملے کو سمجھتے ہوئے ان کاغذات پر دستخط کیے ہیں۔ میں نے اپنے دستخط ایک شاہد اور وکیل کی حیثیت سے کیے ہیں۔ مومن صاحب وقت بدل چکا ہے، حالات سمجھیں۔ آپ بہت بھولے ہیں مومن صاحب۔ ایک بہترین اکاؤنٹنٹ کے علاوہ آپ کچھ نہیں۔ آج تک آپ تانی کے مروڑ تروڑ کو نہ سمجھ سکے، انسانی پیچ وخم کو کیا سمجھیں گے۔ تانی ایک کپڑے کا ٹکڑا ہوتی ہے اور یہاں انسانی روح کے رشتے ہیں۔ نہایت نازک، کہ صبا کا ایک جھونکا بڑے بڑے ایوان پاش پاش کردے اور نہایت مضبوط کہ بڑے بڑے طوفان نہ توڑ سکیں۔ نہایت پیچیدہ ہیں انسانی رشتے، مومن صاحب۔''

لڑکی کی طلاق ہونی چاہیئے۔ آپ لوگ اپنے آپ کو سنبھالیں، معاملہ بہت سنگین ہے۔

مومن نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ جنت کو فوراً سامنے لائیں۔ جنت سامنے آئی۔

مومن: ''یہ کیا ہے جنت ؟ یہ کاغذات دیکھے۔ یہ کاغذات پڑھے تم نے، یہ تمہارے دستخط ہیں؟''

جنت: ''جی ہاں۔''

مومن: ''کیا چاہتی ہو۔''

جنت: ''خلع، جو میرا حق ہے۔ میں مسلمان ہوں۔''

مومن: ''کیوں چاہتی ہو؟ ہم نے تمہاری کیا بات نہیں مانی''

جنت: ''کورٹ میں بتاؤں گی، میں اپنے میکے جا کر علیحدگی شروع کرنا چاہتی ہوں۔ آج۔''

بیگم: ''اری چھنال، ادھر آ میں تیری اکڑ نکالوں......''

کمال: ''دیکھئے میں آپ لوگوں کو پھر وارن کرتا ہوں۔ کسی قسم کی غیر قانونی بات نہ ہونے پائے۔ آپ اس لڑکی کو پہلے ہی حبسِ بے جا میں قید کر چکے ہیں۔ میں گواہ ہوں۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں پولیس میں رپورٹ کروں۔ آپ کو پتہ نہیں کہ آپ اس وقت کس منجدھار میں کھڑے ہیں؟ ہوش میں آئیں۔''

مومن زار و قطار رونے لگے۔ ''کمال میں نے تمہیں اس لئے تو نہیں بلایا تھا۔ میرا بچہ، میرا واجد۔ مجھے یہ وقت دیکھنا رہ گیا تھا''

کمال: ''مومن صاحب، لڑکی کو اگر آج ہی اس کے گھر بھیج دیں تو اچھا ہوگا۔ اس کے وکیل کی حیثیت سے میں کل دیکھنے آؤں گا کہ لڑکی کی علیحدگی شروع کی گئی یا ابھی تک حبسِ بے جا میں قید ہے۔ ہو سکتا ہے پولیس میرے ساتھ آئے۔ میرے کہے کو مذاق نہ سمجھیں۔ میں آپ کا دوست ہوں لیکن اس وقت جنت کا وکیل بھی ہوں اور اپنے مؤکل کو

اس کا پورا حق دلواؤں گا۔'' یہ کہہ کر کاغذات کی ایک کاپی مومن صاحب کو دے کر کمال جلدی جلدی باہر نکل گئے۔

گھر کو سانپ سونگھ گیا۔ سناٹا، سب خاموش ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔ سب کے آنسو ٹپک رہے تھے۔ کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ پچھلے ایک گھنٹے میں کیا ماجرہ ہوگیا۔ ایکدم خاتونِ خانہ کو دورہ پڑا۔ وہ اُٹھیں اور جنت کی کمر پر دو ہتھڑ مار کر چیخنے لگیں ''کمینی، میں تیرا خون پی جاؤں گی۔ اللہ کرے تجھے دو گھڑی کی موت آئے۔ حرام خور، دیکھو میں اپنی بہن سے تیرا کیا حشر کرواتی ہوں۔ تو ٹھہر تو سہی۔ نامراد۔''

''خالہ جان ہوش میں آیئے۔ بھول گئیں انکل کمال کیا کہہ کر گئے ہیں؟ اب آپ میری زبان بند نہیں کر سکتیں''

تھوڑی دیر میں جنت کے شوہر واجد دفتر سے واپس آئے۔ گھر کی حالت دیکھ کر پوچھنے لگے ''کیا ہوا آج، سب پریشان ہیں''

مومن: ''جنت واپس جانا چاہتی ہے، اپنے گھر''

''نہیں اماں نہیں۔ اسکو نہ جانے دینا۔ اس کو بند کردو۔ کمرے سے کھولا کس نے۔ یہ میری بیوی ہے۔ ہم اس کے ساتھ جو دل چاہے کریں۔''

عشاء کی نماز پڑھ کر مومن علی نے اپنے بیٹے واجد کو بھیجا کہ وہ شہاب الدین اور ان کی بیگم کو بلا لائے۔

واجد: ''لیکن ابا جنت کو گھر سے نہ جانے دینا۔ وہ میری بیوی ہے'' یہ کہتے ہوئے واجد اپنی خالہ اور خالو کو بلانے چلے گئے۔

گھر میں قدم رکھتے ہی انکو احساس ہو گیا کہ کوئی بڑا حادثہ پیش آیا ہے۔ مومن علی اور ان کی بیگم رو رہے تھے۔ جنت سامنے نہ تھی۔ ماں باپ سمجھے کہ شاید خودکشی کر لی۔ جنت جنت چیختے ہوئے جنت کے کمرے میں گئے۔ جنت آرام سے بیٹھی تھی مگر رو رہی تھی۔

''بیٹی جنت، جلد بتاؤ کیا ہوا ہے''

''خالہ جان سے پوچھ لیجئے۔ میں کیا بتاؤں'' ماں باپ نے جنت کے پاس بیٹھ کر اپنے آپ کو سنبھالا۔ سانس قابو میں کیا۔ خوش تھے کہ بیٹی زندہ تھی۔ واپس آ کر مومن صاحب سے پوچھا کہ آخر ماجرہ کیا تھا۔

''شہاب الدین! ہمت ہے سننے کی؟۔ ہمارے خاندان میں کسی نے ایسے الفاظ نہ سنے، لو تم سُن لو۔ تمہاری بیٹی طلاق مانگتی ہے۔''

بیگم شہاب الدین: ''یہ! ارے میں اس نگوڑی کے دماغ ابھی ٹھیک کرتی ہوں۔ کیا بکواس کرتی ہے....'' وہ اُٹھ کر جنت کے پاس جانے لگیں۔

رابعہ بیگم: ''پوری صورتحال تو سن لو، معاملہ بہت سنگین ہے''

ہچکیوں کے ساتھ اور نیچی نظروں کے ساتھ پوری بات اور طوفان حوادث سمجھائے گے۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ سب مفلوج دماغوں سے اگلے قدم کا راستہ ڈھونڈ رہے تھے۔ آخر کار شہاب الدین نے ہمت کی اور اپنی بیٹی کو بلایا اور پوچھا کہ وہ آخر کار کیا چاہتی تھی۔

''ابا! آپ نے مجھے بڑے پیار سے پالا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے یہ شادی آپ کے حکم ماننے کی خاطر قبول کی تھی۔ آپکی انا کی خاطر۔ دادی اماں کی انا کی خاطر۔ تجربہ ناکام رہا۔ میں اس ازدواج میں نہیں رہ سکتی۔ آپ لوگ اچھے مسلمان ہیں۔ مجھے میرا حق دیجئے۔ مجھے خلع لینے دیجئے۔ میں مسلمان ہوں۔ مجھے یہاں سے لے چلیں۔ میں فوری علیحدگی چاہتی ہوں، مجھے سکون چاہیے۔''

خاموشی چھا گئی۔ ایسی خاموشی جو کبھی اس گھر کے در و دیوار نے نہ سُنی تھی۔

شہاب الدین: ''مومن بھائی، خدیجہ بہن۔ ہمیں اجازت دیجئے، میں جنت کو لے جانا چاہتا ہوں۔ مصلحت اسی میں نظر آتی ہے۔ اللہ ہماری مدد کرے۔''

مومن زور سے چیخے: ''شہاب الدین، کیا کہہ رہے ہو!''

''مومن بھائی فوری مصلحت اسی میں ہے۔ اللہ سے دعا کرو۔''

رابعہ بیگم: ''خدیجہ بہن، میں معافی مانگتی ہوں۔ مجھے معاف کرنا''

''رابعہ، مجھے معاف کرنا۔ وہی ہوگا جو خدا کو منظور ہوگا۔ کل بات کریں گے''

اور جنت اپنے میکے واپس چلی گئی۔ جنت کی اپنے شوہر سے علیحدگی شروع ہوگئی۔

عدّت

مُرغابی نے پر پھڑپھڑا کے دیکھے کہ اس نے کتنی طاقتِ پرواز حاصل کی ہے۔
واپس زمین پر گری۔ ابھی بال و پر کو بہت پرورش کی ضرورت تھی۔

جنت اپنے کمرے میں آرام سے سوئی۔ اس کے باپ کا گھر تھا۔ گھر کی سوندھی سوندھی خوشبو جس میں اس نے جنم لیا تھا، اس کو خوب پہچانتی تھی۔ خوب مانوس تھی۔ گھر میں دال پر بگھار کی بساند اس کی ناک میں بسی ہوئی تھی۔ ایک بلبل اپنے آشیانے میں آئی تھی۔ سمندری طوفان میں سے گزر کر ایک مُرغابی ایک جھیل میں اُتری تھی۔ اب اس کو آرام کی ضرورت تھی۔ صبح کے دس بج چکے تھے اور جنت کے کمرے کے دروازے ابھی تک بند تھے۔ ماں نے بے چین ہو کر کمرے پر دستک دی ''بیٹی کب تک سوؤ گی؟'' ''نہیں اماں! میں جاگ رہی ہوں''۔ ماں بیٹی نے گھر کا چکر لگایا۔
اب اس گھر میں ایک مطلقہ کو رہنا تھا۔ وہ نونہال جو اس گھر کی رونق ہوا کرتی تھی اب مصیبت، جان بن کر آئی تھی۔ وہ ننگِ خاندان بن کر آئی تھی۔ گھر والوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کو زندہ دفن کر دیں۔ ماں بڑی اُکھڑی اُکھڑی باتیں کر رہی تھیں۔
دادی دوہتھڑ مار مار کر سر پیٹ رہی تھیں۔ گھر میں صرف ایک ہمدرد تھا اور وہ تھے شہاب الدین، ہونے والی مطلقہ کے والد۔ ان کے منہ سے صرف یہ نکلا تھا کہ جو کچھ ہوا بُرا ہوا لیکن اس کے ذمہ دار وہ خود تھے، انکی ماں اور دادی ذمہ دار تھیں۔

شہاب الدین رات کو سو نہ سکے تھے۔ سوجی آنکھوں کے ساتھ بیٹی کے پاس آئے اور پوچھا کہ گزشتہ کل کا واقعہ کیا حقیقت تھا؟ یا ایک بھیانک خواب؟ جنت نے کوئی جواب نہ دیا، خاموش بیٹھی رہی۔ باپ کے سامنے شرمندہ، اپنے وجود کو کوستی رہی۔ ایک طرف اپنے باپ کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی، دوسری طرف اپنی دادی کی انا کا گلہ گھونٹنا چاہتی تھی۔ اپنے ہمزاد سے بار بار پوچھتی کہ آخر اس نے جرم کیا کیا تھا؟ کیا حالات کا سمجھنا جرم تھا؟ کیا اپنا حق مانگنا جرم تھا؟۔ باپ نے پھر خاموشی کو توڑا ''بیٹی وہ کاغذات کہاں ہیں؟'' ''ابا مجھے پتہ نہیں''۔ کہیں یہ مومن علی کو یہ ڈرامہ بازی تو نہیں کر رہے۔ ''خلع تو میں نے خود مانگی ہے۔ ...ابا... مجھے معاف کر دیں....ابا میری مدد کیجئے''۔

تیسرے پہر دستک ہوئی اور معلوم ہوا کہ کمال پاشا آئے ہیں۔ بہت غمگین شکل بنائے ہوئے داخل ہوئے۔ انہیں بند کمرے میں بٹھایا گیا۔

کمال: ''میں زیادہ وقت نہ لوں گا مجھے آپ کی اذیت کا احساس ہے۔ میں یہ کاغذات دینے آیا ہوں۔ آج جنت کی خلع کا کیس داخل کر دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کو اور جنت کو کورٹ میں جانا پڑے۔ میں نے نامور وکیل وحید احمد کو اس کاروائی کے لئے تیار کیا ہے۔ میں خود تمام کاروائی میں حصہ لوں گا۔ اللہ سب کام بخیریت سرانجام دے۔ آپ بھی کاروائی میں مدد فرمایئے گا۔ دعا کیجئے۔''

شہاب الدین: ''کیا یہ سب کچھ حقیقت ہے؟''

کمال: ''بہت بھیانک، مگر حقیقت.........شہاب الدین آپ کو نہیں معلوم کہ جنت پر اس گھر میں کیا کچھ گزری ہے۔ اس کی حبس بے جا کی اگر حالت آپ کو بتاؤں، یا جنت کی دماغی کیفیت کی ترجمانی کروں تو آپ بے ہوش ہو جائیں گے۔ بڑا ظلم کیا گیا ہے اس لڑکی پر۔''

شہاب الدین: ''وکیل کی فیس کون دے گا؟ میں تو بچی کی تعلیم اور شادی میں ہلکو ہو چکا ہوں، کمال صاحب۔''

کمال: ''وہ میری ذمہ داری ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ پورے کاغذات کی کاپی لڑکے کے والد مومن علی خاں کو پہنچا دی گئی ہے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔''

شہاب الدین: ''کمال ایک بات بتاتے جایئے۔ آپ ایک دم میری لڑکی پر اتنے مہربان کیوں ہو گئے؟''

کمال: ''اس کی دو وجوہ ہیں۔ اول، میں نے اتنا اعلیٰ دماغ اور ایسی ہوشمندی کسی فرد میں نہیں دیکھی، جس کی آپ کی بیٹی مالک ہے۔ اس کو ایک مسخ شدہ ماحول میں ختم نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کو بچانا ضروری ہے۔ اس کو اگر اعلیٰ تعلیم دی گئی تو یہ نہ صرف ملک بلکہ دُنیا کے لئے بہت کچھ کر گزرے گی۔ دوسرے یہ کہ لڑکی دماغی طور پر ازدواج کے لئے ابھی تیار نہیں۔ اس کا دماغ بہت آگے اور جنس بہت پیچھے ہے۔ اس کو پڑھنے دیں۔ شہاب الدین صاحب، ہم کو ایک ہی دفتر میں نوکری کرتے بیس سال گزر چکے ہیں۔ آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ نوکری میں تفریحاً کرتا ہوں۔ اللہ کی دی ہوئی جائداد سنبھالے نہیں سنبھل رہی۔ اچھے کپڑوں پر کب تک روپیہ خرچ کرتا رہوں گا۔ اگر کالج کے خرچ کے لئے کچھ مدد کی ضرورت پڑے تو بلا تکلف مجھے بتا دیجئے گا۔ میں آپ کا جانا پہچانا محسن ہوں..... اجازت دیجئے.....میں آتا رہوں گا۔ آپ نے میرا گھر تو دیکھا ہی ہے۔''

کمال کے جانے کے بعد شہاب الدین نے کاغذات پر دوبارہ نظر ڈالی۔ پھر بیٹی کو بلایا ''بیٹی مجھے معلوم نہیں کہ یہ تیری جنت ہے یا دوزخ۔ ان کاغذات کو غور سے پڑھ لے''۔

''لایئے میں پڑھ لیتی ہوں۔ اگر کوئی بات قابلِ اعتراض ہوئی تو میں ضرور آپ کو آگاہ کروں گی.....ابا.....آپکو میں یقین دلاتی ہوں۔ جنت دوزخ نہیں بن سکتی۔ جنت....

جنت ہی رہے گی۔ مجھے پر بھروسا کریں ابا۔" اور جنت سارے کاغذات اپنے کمرے میں لے گئی۔

بغیر پڑھے کاغذات کو الماری میں رکھنے کے لئے جنت نے الماری کھولی۔ اسے یقین تھا کہ کاغذات میں کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ الماری میں اسکی گڑیا بنی بجی بیٹھی تھی "گلشن... تیری تو شادی ہوگئی تھی تو نے نتھ کیوں نہیں اُتاری؟" یہ کہہ کر وہ ہنسی اور کاغذات ہوا میں اُڑا دیے۔ شادی کے بعد جنت نے پہلی بار خوشی کو اظہار کیا تھا وہ بھی اپنی واحد رازدار گلشن کے سامنے۔ "گلشن میری شادی ہوئی تھی، میں اُمید سے ہوں۔ اس اُمید سے کہ شاید میں آزاد ہو جاؤں اور مجھے پڑھنے کی اجازت مل جائے۔ اب میں پڑھوں گی، تیرے سامنے پڑھوں گی۔"

زمین پر بکھرے ہوئے کاغذوں کو جنت گھورتی رہی۔ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ جو کچھ ان کاغذوں میں لکھا ہے ایک دن وہ حقیقت بن کر سامنے آجائے۔ اس کو یقین ہو جائے کہ وہ کسی کی مانگ نہیں، کسی کی بیوی نہیں، کسی کی بہو نہیں۔ وہ واحد جنت ہے۔ اس نے اوپر نظر اٹھائی تو اس کو کتابیں نظر آئیں۔ جگہ جگہ بکھری ہوئی کتابیں۔ کبھی اس کی نگاہیں ان کتابوں کے حروف میں کنگھی کرتی تھیں، اس کی انگلیاں ورق گردانی کرتی تھیں، الفاظ دماغی خلیوں میں نقوش بناتے تھے۔ اب اپنی مالکہ کا انتظار کر کر کے ایک ایک لفظ خوابِ غفلت میں سو چکا تھا۔ جنت نے اپنے کندھوں پر نئی ذمہ داری محسوس کی۔ ان سب کو جگاتا ہے۔ ان کتابوں کے حروف میں جان ڈالنی ہے۔ پھر ڈر لگنے لگا کہ کہیں وہ مردود اپنی حق داری کا ڈھونگ رچانے نہ آجائے۔ جنت گھبرا اُٹھی اور زمین پر بکھرے ہوئے کاغذات کو سنبھالا" تم ہی میرا واحد سہارا ہو" کہتی گئی اور ایک ایک کاغذ اٹھا اٹھا کر ایک فائل کور میں رکھ لئے۔ احتیاط سے الماری میں محفوظ کر لئے۔

جنت کا دل کہتا تھا کہ وہ اب اس احمق سے نجات پا لے گی۔ بہت دنوں بعد
اُمید نے ہونٹوں پر تبسم کی کرن ڈالی" میں آزاد ہو جاؤں گی، میں پڑھوں گی، میرے
دماغ کو علم کی غذا چاہیئے۔ بھوک لگی ہے"۔ اپنی خوشی کو دوپٹے سے ڈھانکتے ہوئے
جنت اپنے کمرے سے باہر آئی۔ دادی اماں سامنے بیٹھی تھیں،" نامراد، ننگِ خاندان،
کمبخت مرتی بھی تو نہیں!" یہ کہہ کر منہ موڑ لیا۔ سامنے اماں آ رہی تھیں" کھانا دانا خود
ہی پکانا، اب مجھ سے کچھ نہ مانگنا! کفرانِ نعمت کر کے اس مقام پر پہنچی ہو، جاؤ جہنم میں"۔
برآمدے سے باہر نکلی، اپنے پیارے انگنا میں آئی۔ اسی آنگن میں تو وہ جوان ہوئی تھی،
اس کی تو وہ ایک ایک ذرّے سے واقف تھی۔ چکر لگاتی رہی، کان گونجتے رہے "چھوٹی
سی بالما مورے انگنا میں گلّی کھیلے"۔ یہیں سے تو وہ چلچلاتی دھوپ میں سائکل لے کر نکلی
تھی۔ یہاں سے کبھی کبھی بگولے بھی اُٹھا کرتے تھے۔ اس کی تمنا اس کے لبوں پر دعا بن
کر آئی۔ "اللہ ایک بگولا آئے اور مجھ کو اُڑا کر، گھماتا ہوا ملک چین میں لے جائے۔
میں علم حاصل کروں۔ ہمارے حضورؐ نے بھی تو یہی کہا تھا"۔ یادوں کی بوچھاڑ نے سر
چکرایا اور وہ افسردہ دل برآمدے میں واپس آئی۔ گھر والوں نے لاتعلقی اختیار کر رکھی
تھی۔ اب اس کو اس گھر کا عضوِ معطل قرار دیا جا چکا تھا۔ سب نفرت کی نگاہ ڈالتے۔
باپ ہمدرد تھا مگر خاموش تماشائی بنا رہا۔ عدت کے دن گزرنے شروع ہو گئے۔

ایک ہفتہ بعد جنت ہمت کر کے اپنے باپ کے سامنے دو زانو بیٹھ گئی اور
آنسوؤں کا سہارا لے کر التجا کی کہ اسے اپنی سہیلیوں سے ملنے کی اجازت دی جائے۔ وہ
عدت کی مدت میں باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی۔ اسکی سہیلیوں کو خبر دی جائے کہ وہ اس کے گھر
آ کر ملیں۔ باپ نے اپنی بیٹی کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ ایک مظلوم کی معصوم عرض تھی۔
ایک معصوم التجا، گھٹن میں سانس لینے کی اجازت، حاکم کے سامنے معروضہ، باپ کے
سامنے فرمائش۔ باپ اُٹھا اور اپنی بچی کو سینے سے لگا لیا۔ "میں تیرا کیا کروں؟ میری

لاڈو، ہم تجھے خوشیاں نہیں دے سکتے تو دوسرے تو دے سکتے ہیں۔ جل، اپنی سہیلیوں سے مل، ضرور مل میری بچی"۔ شہاب الدین نے اپنی بیٹی کی سہیلیوں کو بلاوا بھیجا کہ وہ جنت سے آ کر ملیں۔ ان میں مارلین اور ماہ نور سرِ فہرست تھیں۔ جنت کی خودکشی کی ناکام کوشش کی تفصیلات پہلے ہی ماہ نور کا بھائی رضوان ماہ نور کو بتا چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو فلمی انداز کا ہیرو قرار دے چکا تھا۔ لیکن ماہ نور کو جنت کی قید کا اور مزید تفصیلات کا بالکل علم نہ تھا۔ مارلین کو صرف اتنا پتہ تھا کہ جنت کی شادی ایک مسلم دقیانوسی خاندان میں زبردستی کی گئی تھی اور اس کو سینٹ سٹیفن کالج سے اٹھا لیا گیا تھا۔ شادی کے بعد مارلین نے دور رہنے میں مصلحت سمجھی کیونکہ یہ رومن کیتھولک عیسائی تھی۔

دونوں سہیلیاں جنت سے ملنے اکٹھی آئیں۔ گھر کا ایٹموسفیئر دیکھ کر دونوں سہیلیاں بے حد پریشان ہوئیں۔ جنت نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ دادی اماں منہ موڑ کر باہر برآمدے میں جا بیٹھیں۔ اماں نے صرف اتنا کہا "جنت اس کمرے میں ہے وہیں چلی جاؤ"۔ پریشان حال، ایک نئی فکر کے ساتھ دونوں سہیلیاں کمرے میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھا کر پہنچیں۔ جنت اُجڑی اُجڑی سی بیٹھی تھی۔ اپنی رازدار ہمجولیوں کو دیکھ کر اُٹھی سسکیاں لیتی رہی اور بے قرار ہو کر چمٹ گئی۔ وفورِ اشکِ پیہم سے آواز کسی کی نہ نکلی۔ پھر تینوں نے سنبھالا لیا۔

ماہ نور: "جنت خیر تو ہے؟ کیا ہوا کیا"

جنت: "مجھے طلاق ہو رہی ہے"

مارلین: "کیوں؟"

جنت: "میں مانگ رہی ہوں۔ طلاق نہیں تو خلع تو ضرور لوں گی"

بیشتر اس کے کہ مزید حالات پوچھے جاتے دونوں مہمان لڑکیوں کو اپنی فکر ہوئی کہ اگر جنت جیسی لڑکی کے ساتھ یہ سلوک ہو سکتا ہے تو ان کیساتھ کیا ہوگا۔ دونوں سہیلیاں اپنے آپ

کو جنت سے بدتر سمجھتی تھیں۔ آہستہ آہستہ، پیاز کے چھلکوں کی طرح حقیقت پر سے اوراق اتارے جاتے رہے۔ بار بار آنکھوں سے پانی پونچھا جاتا۔ یہ آنسو نہ تھے بلکہ حقیقی پیاز کا اثر تھا۔ جب پردۂ سکرین پر پورا ڈرامہ پیش ہو چکا ہوتو سانسوں میں قرار پیدا ہوا۔ حادثہ کی تاریکی کے ساتھ کچھ روشنی کی کرنیں بھی چمک رہی تھیں۔

Marlene: "Jannat, Wilsons are moving to England. You know that we are Roman Catholics, and a cross breed Anglo-Indians. Now, India is an independant state. We are not, and will not be ever welcomed here. My dad got a job and I shall be joining college in London or somewhere else in UK.

جنت: ''مجھے چھوڑ جاؤ گی''

مارلین: ''میرا بس چلے تو میں تمہیں اپنے بستر میں لپیٹ کر سمگل کرلوں''

ماہ نور: ''اپنی ہیرو کو ہم کیسے سمگل ہونے دیں گے۔ مارلین، غور سے سنو۔ ڈرامے کا ایک سین پیش کیا جاتا ہے۔ ریل کا پل ہے... پل کے نیچے سے ٹرینیں گزر رہی ہیں... پل کی منڈیر پر ایک دوشیزہ بے حد خوبصورت ہیروین اپنا دوپٹہ اڑا کر چیخ رہی ہے'' دور ہو جاؤ میں مروں گی'' اور پھر ہیرو منڈیر پر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور ہیروین سے چمٹ کر، سینے سے لگا کر اس کو بچالیتا ہے.....تالیاں!''

جنت: ''بکواس نہ کر ماہ نور''

ماہ نور: ''میں کوئی جھوٹ بولیا؟ میں کوئی کفر تولیا؟''

جنت: ''مارلین میں سچ کہتی ہوں، مجھے کچھ یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ میں پل کی منڈیر پر چڑھی تھی اور ریل کو دیکھ رہی تھی کہ کب ریل آئے گی۔ پھر میرے سر پر چوٹ لگی تھی اور میں بے ہوش ہوگئی تھی۔ پھر گھر میں ہوش آیا تھا۔ باقی سب میری یادداشت سے بٹ چکا ہے۔''

ماہ نور: ''ہیرو کا نام رضوان تھا۔ وہ بھی یاد نہیں؟ وہ میرا بھائی ہے، یہ بھی یاد نہیں؟ مارلین، ڈرامہ تو اب شروع ہوا ہے۔''

مارلین: ''اس ڈرامے کا آخری سین دیکھنے کے لئے بے تاب رہوں گی، مگر میں انگلینڈ میں ہوئی تو کیسے دیکھوں گی؟''

ماہ نور: ''ہم ہیروئین کو انگلینڈ بھیج دیں گے۔ ہو سکتا ہے رضوان بھائی کو اپنی ریسرچ کے واسطے وظیفہ مل جائے۔ کسی کو کیا پتہ ہے کہ کیا ہونے والا ہے''

جنت: ''کسی کو کیا پتہ ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ میرے سامنے کی منزل میری تعلیم ہے اس کے بعد جو ہوگا اللہ بہتر کرے گا۔ تم تو دونوں میرے واسطے دعا کرو۔ اس وقت میں بہت پریشان حال ہوں۔ عدت کی مدت میں میں باہر نہ نکلوں گی۔ میری پڑھائی کا ایک سال برباد ہو رہا ہے۔ تم لوگ ملتے رہنا''۔

"Marlene: Please keep me posted about college activity. I will continue my education some day"

مومن علی کے گھر میں حالات بہت مختلف تھے۔ جنت کے جانے کے بعد دوزخ کی آگ کی تپش سب محسوس کر رہے تھے۔ مومن اس آگ سے جلد از جلد اپنے گھر کو بچانا چاہتے تھے۔ انہوں نے مسجد کے امام سے مشورہ لیا اور ساری صورتحال بتائی۔ امام صاحب نے آگاہ کیا کہ حق زوجیت کا معاملہ اگر در پیش ہو تو غلاظت کا عنصر بہت ہوتا ہے۔ اس میں کمزوری لڑکے کی ہے جو ڈاکٹری معائنہ سے ثابت ہو جائے گی۔ مصلحت اسی میں ہے کہ جتنی پردہ پوشی ہو سکے، کی جائے۔ خاموشی سے اور شرافت سے اس کو حل کیا جائے۔ لڑکی کے خلع لینے میں مہر دینا ضروری نہیں۔ لیکن اس کیس میں سسرال کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے کیونکہ حالات ایسے خراب تھے کہ لڑکی بغیر مہر کے چھٹکارہ حاصل کرنے پر راضی ہو گئی۔ اس کے مقابلے میں اگر مہر دے کر لڑکی سے چھٹکارہ پایا جائے تو الزام لڑکی پر جاتا ہے کہ لڑکے والے اس لڑکی کو کسی قیمت پر ازدواج میں رکھنے کو تیار نہ

تھے۔ بہتر راہ عمل یہی تھا کہ مہر دے کر لڑکی سے چھٹکارہ پایا جائے۔

مومن علی نے مہر دینے کا فیصلہ کیا اور پانچ ہزار روپے (جو لڑکی کا مہر تھا) کا بندوبست کرنا شروع کر دیا لیکن بہت خاموشی سے۔ لڑکی کے خاندان سے بے تعلق رہے۔ ایک مہینے بعد مومن علی نے ایک وکیل کو لڑکی سے ملنے اور مصالحت کرنے کے لئے بھیجا جو ایک رسمی اور قانونی ضرورت تھی۔ ملاقات منٹوں میں ختم ہوتی۔ پھر ہر ماہ یہ کاروائی دہرائی جاتی رہی۔ لڑکی والوں اور لڑکے والوں کو اب اپنا اپنا مستقبل صاف نظر آ رہا تھا۔ دو خاندانوں میں شاید یہ پہلی طلاق تھی۔ ازدواج گردکارواں کے غبار میں دھندلا رہا تھا۔

تین ماہ گزرنے کے بعد کمال پاشا شہاب الدین کے گھر پہنچے اور صورتحال پوچھی۔ انہیں بتایا گیا کہ لڑکی کی طلاق کی کاروائی مکمل ہو چکی تھی۔ جنت مطلقہ ہو چکی تھی، مہر دیا جا چکا تھا۔ اور یہ خبر دے کر باپ نے آہ بھری، آسمان کی طرف دیکھا ''میری جنت کو طلاق ہو گئی'' اور رو پڑے۔

کمال: ''شہاب الدین صاحب ہمت کریں۔ میرے خیال میں یہ خوشی اک موقعہ ہے کہ اس مسئلہ کو زیادہ نہ کھینچا گیا۔ شرافت اور خاموشی سے یہ معاملہ اختتام پذیر ہوا''

شہاب الدین: ''تم لڑکی کے باپ ابھی نہیں بنے ہو، تمہیں کیا معلوم کہ لڑکی کے باپ کی دماغی کیفیت کیا ہوتی ہے''

کمال: ''بیشک مجھے آپ کی اذیت کا احساس ضرور ہے۔ اللہ آپ کی تمام مشکلیں آسان کرے اور آپ کی جھولی خوشیوں سے بھر دے''

شہاب الدین: ''آمین، آمین''

کمال: ''شہاب الدین صاحب میں ایک بہت اہم بات کرنے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں''

کچھ دیر خاموشی سے دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہے۔

کمال: ''شہاب الدین صاحب، مجھے آپ اپنی غلامی میں قبول کرلیں''

شہاب الدین: ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

کمال: ''میں جنت سے شادی کرنا چاہتا ہوں''

شہاب الدین: ''دماغ خراب ہے تمہارا؟ کیا احساس ہے تمہیں کہ تمہاری عمر کیا ہے اور جنت کی عمر کیا ہے؟''

کمال: ''تقریباً تیس سال کا فرق ہے''

شہاب الدین: ''اور پھر بھی اس رشتے کے لئے تیار ہو''

کمال: ''جی ہاں، میں جنت کو اس مقام پر پہنچانا چاہتا ہوں جس کی وہ حقدار ہے۔ میں اس کی تعلیم کا ذمہ لیتا ہوں۔ میں اس کی تعلیم کا انگلینڈ میں ذمہ لیتا ہوں۔ میں اس کو خوش رکھ سکوں گا۔ وہ ایک ایسا ہیرہ ہے جو کوڑے میں پڑا ہوا ہے''

شہاب الدین: ''اور تمہارے خیال میں لڑکی اس واہیات رشتے پر تیار ہو جائے گی؟ اپنے باپ کی عمر کے آدمی سے شادی کرلے گی؟''

کمال: ''لڑکی سے پوچھ لیجئے۔ اگر وہ تیار ہے تو مجھے اپنی غلامی میں ضرور لے لیجئے، لیکن اگر وہ تیار تو''

شہاب الدین: ''کمال مجھے اپنی حالت پر چھوڑ دو، چلے جاؤ یہاں سے''

کمال: ''میں چلتا ہوں، کل پھر حاضر ہوں گا''

کمال کے جانے کے بعد شہاب الدین سر پکڑ کر بیٹھے رہے۔ منہ میں بُڑبڑاتے رہے ''یا اللہ خیر، یا اللہ خیر''۔ ان کے سامنے... یہاں.....ابھی کون بیٹھا تھا؟ اس کی ٹی شرٹ نئی تھی، چھریرا جسم۔ کیا وہ کوئی خوشبو لگا کے آیا تھا؟ ابھی تک کچھ مہک آرہی ہے۔ یہ کیوں آیا تھا، میری پریشانی بڑھانے کے لئے..........یا......میری

پریشانی دور کرنے۔ شہاب الدین نے سر ہلایا، کھڑے ہوئے اور اندر چلے گئے۔
سوچتے رہے... سوچتے رہے۔ کمال نے ہی.... شاید... جنت کو طلاق لینے پر اکسایا تھا؟
..... طلاق کے پہلے کاغذات تو.... کمال ہی نے بنوائے تھے۔ یا اللہ میری سمجھ میں کچھ
نہیں آرہا۔ کیا اب میں خاموش بیٹھا رہوں؟ میں خاموش نہیں رہ سکتا؟ زور سے
آواز دی ''جنت''۔ جنت گھبرا کر آئی۔ ''بیٹی دروازہ بند کردے، دروازہ بند کر
دے'' دروازہ بند کیا گیا۔ ''بیٹی... جنت بیٹی... بیٹی... میں بہت معمولی انسان ہوں،
کمزور ہوں لیکن مجھ سے امتحان بڑے سخت لئے جارہے ہیں۔ میں نے ہمیشہ تجھ سے کھل
کر بات کی ہے اور تو نے بھی ہمیشہ دوٹوک بات کی ہے۔ میری آنکھوں میں دیکھو۔
اپنے باپ کی آنکھوں میں دیکھ.... اور بتا.... اپنے باپ کی عمر کے آدمی سے دوسری شادی
کرے گی؟'' باپ اپنی بیٹی کے تاثرات، چہرے پر پڑھنے لگا۔ جنت کے سنجیدہ
چہرے پر کچھ نمی آئی اور ہلکی سے تبسم کی لہر زیرِ لب متحرک ہوئی۔ جنت خاموش بیٹھی رہی،
پھر دوپٹہ میں منہ چھپا لیا۔

شہاب الدین: ''جا... جا... چلی جا یہاں سے۔''

شہاب الدین دماغی طور پر بہت تھک چکے تھے۔ پلنگ پر آرام ضروری سمجھا۔ خلاء میں
گھورتے رہے۔ وقت نے گزشتہ حالات دہرانے شروع کئے۔ کمال! بیس سال پہلے
کمال کی شادی ہوئی تھی۔ اس کی شادی میں پستہ کی لوزمات بنی تھیں۔ مٹھائی کو ادنٰی
سمجھا گیا تھا۔ ڈیڑھ ہزار مہمانوں میں دہلی کے امراء شامل تھے۔ بہت امیر گھرانا تھا۔
شادی کے ایک سال بعد... ہاں ایک سال ہی گزرا ہوگا... کہ ان کی بیوی کا انتقال ہو
گیا تھا۔ ...... عجیب انسان ہے... پھر شادی نہ کی..... اس بچے کی یاد میں روتا رہا جس
کے جنم میں بیوی اللہ کو پیاری ہوئی۔ اپنی دولت دوستوں پر اور اپنے کپڑوں پر خرچ کرتا
رہا..... لیکن دفتر نہ چھوڑا۔ سرکاری دفتر میں بڑی پابندی سے حاضری دیتا رہا... خالی کیا

کرتا؟ .... کچھ نہ کچھ تو.... کرنا ضروری تھا.... زندگی کا شا آسان .... نہیں۔ ''ارے سنتی ہو.... جنت کی ماں'' گھبرا کر آواز دی۔

جنت کی ماں گھبرائی ہوئی آئیں ''اے ہے خیر تو ہے۔ میں تو ڈر گئی، ایسی بے چینی میں آپ نے آواز دی''

شہاب الدین: ''کمال پاشا کو جانتی ہو نا؟''

بیگم: ''ہاں وہی دفتر والے''

شہاب الدین: ''جنت کا ہاتھ مانگتے ہیں، شادی کرنا چاہتے ہیں''

بیگم: ''کیا بالکل ہی سٹھیا گئے ہیں آپ؟ آپ کی عمر کا آدمی ہے وہ!''

شہاب الدین: ''ہاں''

بیگم: ''جنت کو میں دوبارہ دوزخ میں نہ جلنے دوں گی، جان پر کھیل جاؤں گی۔ مجھے یہ آدمی ٹھیک نہیں لگتا۔ مجھے تو عیاش لگتا ہے۔ اور سنئے! کہیں ایسا نہ ہو کہ اس نے یہ سارا سوانگ رچایا ہو۔ میری بیٹی کو میری بہن سے چھنا کر اب اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کمینہ... کمبخت... نامراد۔ نہیں نہیں، کبھی نہیں۔ یہ نہ ہونے دوں گی''

بلند آواز سے باتیں سن کر دادی اماں کو بے چینی ہوئی۔ بھاگی ہوئی اپنے بیٹے اور بہو کے پاس آئیں اور پوچھا ''ہائے اللہ خیر تو ہے یا بیٹی نے کوئی نیا گل کھلا دیا''

شہاب الدین: ''اماں جنت کو اس کے حال پر چھوڑ دیں، بڑی دکھیا ہے''

دادی اماں: ''میں دکھیا ہوں یا وہ حرام خور؟ میرا منہ کالا کر دیا، سمجھے نہیں سمجھے''

شہاب الدین: ''اماں سکون سے میری بات کا جواب دیجئے۔ جنت کی طلاق تو ہو چکی ہے۔ اب اس کو دوسری شادی تو کرنی ہے نا۔ کب تک گھر میں بیٹھی رہے گی''

دادی اماں: ''پڑھاؤ دو بول اور کرو کسی کے حوالے اس کتیا کو''

شہاب الدین: ''اماں، میری عمر کے برابر کا آدمی اس کے واسطے ٹھیک رہے گا؟''

دادی اماں: ''بالکل ٹھیک رہے گا، فوراً شادی کردے شہاب الدین۔ یہ ناگن ہے۔ کسی واجد جیسے بھولے بھالے انسان کو نچ کر کھا جائے گی۔ اس کو تو کوئی دوحاجو، پکی عمر کا سخت بندہ چاہیئے جو دو جوتیاں دن کو مارے اور چار ڈنڈے رات کو۔ اس کے منہ پر تھوکتا رہے۔ یہ شریفوں کے گھر نہیں رہ سکتی۔ اس کی سہیلیوں کو دیکھو...وہ...وہ ...کرستان وہ عیسائی، وہ پھر آئی تھی، اُکسا کر گئی ہوگی۔شہاب الدین کوئی ادھیڑ عمر کا آدمی ڈھونڈ اس کے لئے اور اس کو گھر سے نکال۔ منحوسیت پھیلا رکھی ہے اس کمبخت نے''

شہاب الدین: ''اماں میں ہاتھ جوڑتا ہوں، خاموش''

جنت کو میجورٹی ووٹ مل چکے تھے۔ باپ تیار تھا، دادی تیار تھی، ماں تیار نہ تھی۔

دوسرے روز کمال پھر آئے شہاب الدین نے خریداری نگاہ سے دیکھا۔ آج کمال سوٹ میں آئے تھے۔ کریمی کا سفید سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سلک کی نئی ٹائی باندھی ہوئی تھی۔ پھر غور سے دیکھا۔ کمال اپنی عمر چھپانے کے ماہر تھے۔ چھریرا بدن اور دراز قد ان کی ہمیشہ اس امر میں مدد کرتے رہے تھے۔ سر کے کچھ بال کانوں کے اوپر سے سفید ہونے شروع ہو گئے تھے۔ ان کو قبول صورت کہا جا سکتا تھا۔ شہاب الدین کے سامنے پہلی بار باادب بیٹھ گئے اور پوچھا ''کیا سوچا آپ نے؟''

شہاب الدین: ''مجھے کیا سوچنا ہے۔ میں بہت سوچ چکا ہوں اب سوچنے والی کو سوچنا ہے۔ لڑکی کو بلاتا ہوں کہ اسلامی حقوق دے سکوں'' یہ کہہ کر جنت کو آواز دی۔ جنت رلائی میں لپٹی ہوئی آئی اور ادب سے باپ کے سامنے بیٹھ گئی۔

شہاب الدین: ''جنت، میرا فرض ہے کہ میں تمہاری دوسری شادی تمہاری مرضی کے بغیر نہ کروں۔ یہی ہمارا مذہب کہتا ہے۔ میں تمہاری شادی کمال پاشا صاحب سے کرنا چاہتا ہوں جو تم سے تیس سال عمر میں بڑے ہیں اگر تمہیں منظور ہے تو اُٹھ کر چلی جاؤ اور

اگر نامنظور ہے تو اپنی زبان سے نامنظور کہو اور بیٹھی رہو"۔

جنت نے ادب سے "آداب" کہا اور اُٹھ کر چلی گئی۔ شہاب الدین کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ کمال پاشا آؤٹ آف فوکس ہوئے جارہے تھے۔ یہ کیا ہو رہا تھا۔ حالات کی تبدیلی کی رفتار اتنی تیز تھی کہ نہ انکے ہاتھ میں باگ تھی اور نہ ہی رکاب میں پیر۔ مگر کاٹھی پر گرفت مضبوط محسوس ہو رہی تھی۔ گرنے کا امکان محسوس نہ ہوا۔ "یا اللہ خیر، اللہ جو کچھ بھی کر ہماری بہتری اسی میں ہو"

کمال: "اللہ جو کچھ بھی کرے ہماری بہتری اسی میں ہو"۔ کمال نے جیب سے ہیرے کی انگوٹھی نکالی اور شہاب الدین کے حوالے کر دی اور پھر بولے" شہاب الدین صاحب، ہمیں اس معاملے میں دیر نہ کرنی چاہیئے۔ میں آپ کو اپنا پلین بتا دوں۔ میرے بڑے بھائی لندن میں ایک بینک کے وائس پریزیڈنٹ ہیں۔ شاید آپ کو یاد ہو۔ جمال پاشا مجھ سے چار سال بڑے ہیں۔ جنت کی اعلیٰ تعلیم کی ذمہ داری میں ان کو دے رہا ہوں۔ میرا خیال ہے ہم ہنی مون لندن میں منائیں گے۔ اگر آپ اس کو مناسب سمجھتے ہیں تو بسم اللہ کریں۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ میں اپنی ذمہ داریاں انشاءاللہ اچھی طرح سے نبھاؤں گا۔ آپ کو کسی قسم کی شکایت کا موقعہ نہ دوں گا۔

شہاب الدین: "یا اللہ خیر کچھ"

شادی

ابھی جنت کی عدت پوری ہوئے کوئی مہینہ ہی گزرا تھا کہ جنت کا نکاح بغیر کسی دھوم دھام یا کسی اور نئے ہنگامے کے سرانجام پایا۔ نکاح میں دفتر کے چند آدمی تھے۔ لڑکیوں میں مارلین ولسن اور ماہ نور تھیں اور لڑکوں میں ماہ نور کا بھائی رضوان تھا۔ نکاح کی رسم اتنی سادگی سے کی گئی کہ محلّہ والوں تک کو اس اہم واقعہ کی خبر نہ ہوئی اور جنت وداع ہو گئی۔

دادی اماں اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑی رہیں۔ انہوں نے اُٹھ کر ہی نہ دیا۔ جنت کے جانے کے بعد دادی اماں بہت خوش تھیں کہ ان کے بیٹے کی عمر کا آدمی جنت کو مار مار کر اس کے سارے بل نکال دے گا۔ بار بار کہتیں" آگ لگے اس انگریزی تعلیم کو...سب تعلیم کا قصور ہے۔ ہماری بچیوں کو تباہ کر دیا۔ اُس کرستان کو دیکھو، چلیا کٹا کر ہمارے ہاں آتی تھی۔ موئی کے بالوں کا رنگ بھی مردار چوہے جیسا ہے۔ گِٹ پِٹ کر کر کے کیا پٹی پڑھائی کہ شریفوں کی بچی اتنی سی عمر میں دو دو خصم کر بیٹھی اور اس کی عمر دیکھو۔ ہائے میں کیا کروں، میرا بس چلے تو میں اس کرستان کی کھال اُتار کر الگنی پر لٹکا دوں۔ حرام خور... سمجھے نہیں سمجھے۔"

وداع کے تیسرے دن ولیمہ قرار پایا گیا۔ اس تقریب میں دلہن کو سجایا گیا۔ حالانکہ دل آرام کو مشاطہ کی ضرورت نہیں ہوتی مگر کمال پاشا کو اپنے دل کے تمام ارمان نکالنے کا یہی موقعہ ملا تھا۔ دلہن کے سولہ سنگار کروائے گئے اور مہمانوں کے سامنے دلہن

خرامِ ناز کے ساتھ جلوہ افروز ہوئی۔ بال جو ہمیشہ چنبیلی کے تیل میں چکنے رہتے تھے اور چٹیا میں جکڑے رہتے تھے، آج تمام بندشوں سے آزاد تھے۔ زلفیں لہرا رہی تھیں۔ حریر آنچل میں سے سیاہ گھنے بال ایسے لگ رہے تھے جیسے سفید بادلوں کے ٹکڑوں پر کالی گھٹا جھوم کر آئی ہو۔ دلہن کو اپنی زندگی میں پہلی بار اپنی پلکیں اتنی بھاری لگ رہی تھیں کہ لالہ رُخ کی آنکھیں کھولے نہ کھلتی تھیں۔ کمر شاخِ بید مشک بنی ہوئی تھی کہ غرارے کے وزن سے لچک لچک جاتی تھی۔ زعفرانی ریشمی لباس میں سرخ و سپید چہرہ مہرِ نیم روز کی طرح چمک دمک رہا تھا۔ دلہن کے وجود سے ہال مہک مہک اُٹھا۔ مہمانوں کو ایک رعنائی خیال کا وہم سا ہو رہا تھا۔

مہمان گنے چنے تھے اور زیادہ تر دولہا کی طرف سے مدعو کیے گئے تھے۔ سب نے سیدھے سادے کپڑے پہن رکھے تھے مگر چند کی انگوٹھیوں کے ہیرے انکی دولت کی غمازی کر رہے تھے۔ لڑکی کی طرف کے مہمان انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ لڑکی کے ماں باپ، لڑکی کی تین سہیلیاں، ماہ نور کا بھائی رضوان اور شہاب الدین کے دو دوستوں کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ دادی اماں کی غیر حاضری نمایاں تھی اور سب نے محسوس کی۔ دلہن کو دیکھ کر سب مہمانوں کا ایک جیسا ردِ عمل تھا۔ ''ماشاء اللہ'' یہ حُسن ابھی تک کہاں چھپا ہوا تھا۔ کاش دولہا کی عمر کم ہوتی''

پُر تکلف کھانا ہوا، تحفے دیے گئے۔ کھانے کے بعد کمال پاشا نے اعلان کیا کہ انہوں نے گورنمنٹ سروس سے استعفا دے دیا ہے اور وہ اپنے ہنی مون پر لندن چلے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہیں وہ مستقل رہائش اختیار کر لیں۔ یہ سُن کر جنت کی سہیلی مارلین بھاگی بھاگی جنت کے پاس پہنچی اور سرگوشی میں کہا ''جنت، لندن جانے کا پروگرام تو میرا خاندان بنا رہا تھا اور تم ہم سے پہلے لندن جاؤ۔ ہمارے امیگریشن میں ابھی دو مہینے ہیں۔ تم بہت عجیب چیز ہو۔

"I know what torture you have gone through. Look now, how beautifully you have started to bloom. From the core of my heart I say

اللہ مبارک کرے"۔

ولیمے کے بعد جنت نے اپنے میاں کمال پاشا کے ساتھ لندن روانہ ہونے کی تیاری شروع کردی۔

دِلّی دُور است

جنت کی آمد و رفت ابھی تک دلّی کے گلی کوچوں تک ہی محدود رہی تھی۔ دلّی کا نقشہ، سینٹ سٹیفن کالج کا راستہ، کیناٹ پلیس اور قطب مینار کا حدود اربعہ اچھی طرح دماغ پر نقوش بنا چکا تھا۔ اٹلس پر بھی دُنیا کے تمام ممالک اور انکے دارالخلافوں کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اس کو یہ احساس بھی تھا کہ داستانِ امیر حمزہ کے سات سمندر اور انڈین اوشن کو عبور کرنے میں بہت فرق تھا، مگر ابھی ناتجربے کار تھی۔ کبھی ریل کا سفر تک نہ کیا تھا۔ شہاب الدین نے دلّی کی گلیاں کبھی چھوڑی ہی نہ تھیں۔

جنت کو جب یہ بتایا گیا کہ وہ ہوائی جہاز سے لندن جا رہی ہے تو بہت سے سوال اس کے دماغ میں اُٹھے جن کا صرف تجربہ ہی جواب دے سکتا تھا۔ اس نے دماغ پر زور نہ دیا۔ صرف اتنا سوچ کر خاموش بیٹھ گئی کہ "بڑا مزہ آئے گا"۔ اس کے مقابلے میں کمال پاشا ایک دفعہ لندن جا چکے تھے اور ایک ماہ کی چھٹیاں اپنے بڑے بھائی جمال پاشا کے ساتھ کاٹ چکے تھے۔ انہیں ہوائی جہاز کے سفر کا تھوڑا سا تجربہ تھا۔ جنت نے سفر کا سامان باندھنا شروع کیا ہی تھا کہ دادی اماں بے قرار ہو کر جنت کے کمرے میں آئیں۔

"اے کہاں جا رہی ہو؟ کچھ نہیں سمجھے"

"دادی اماں ہم لندن جا رہے ہیں"

"وہ تو کوسوں دور ہے۔ سُنا ہے یہ موئے انگریز وہیں تو رہتے ہیں اور سُنا ہے جو چلا گیا

واپس نہ آیا......ہمیں چھوڑ جاؤ گی؟''

''میں واپس آؤں گی دادی اماں۔ مجھے اب دوبارہ زندگی ملی ہے۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ جا رہی ہوں۔ میں آؤں گی،ضرور آؤں گی، دادی اماں''۔

دادی اماں موم کی طرح پگھل گئیں۔ شمع کی طرح آنسو ٹپکنے لگے۔

جنت نے اپنی ساری کتابیں جمع کیں،گھر گرہستی کا سامان پیک کیا،پتیلیاں نکالیں،بڑا اصل بدھنا لیا،چھوٹے اصل بدھنے کو دھو کر تیار کیا،غسل خانے کا سامان پیک کیا۔ آدھا کمرہ جنت کے سفر کے سامان سے بھر گیا۔ جب کمال آئے تو صورتحال دیکھ کر بڑے پریشان ہوئے اور ہوائی سفر کی پولیسی کا اعلان کیا۔ سامان ۶۰ پونڈ فی عدد سے زیادہ نہ ہو۔ جنت نے کہا ''اتنے وزن میں صرف کچھ کپڑے ہی رکھے جا سکتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں۔ چار پاؤنڈ کا تو صرف پیتل کا لوٹا ہی ہے''

''آپ لوٹا نہیں لے جا سکتیں''۔

''طہارت کیسے ہوگی، کیا لندن میں سب لوگ گندے رہتے ہیں؟''

''نہیں،یہاں سے زیادہ پاک صاف رہتے ہیں لیکن انداز طہارت مختلف ہے۔ آپ کو یہ سب کچھ چھوڑنا پڑے گا۔ صرف کپڑے سوٹ کیس میں پیک کیجئے۔ آپ کو زیادہ تر نئے کپڑے خریدنے پڑیں گے۔''

''اور ان کپڑوں کا کیا ہوگا؟''

یہ بھی پہننے گا،مگر موقعہ موقعہ پر''۔

جنت نے سب سے پہلے اپنی گڑیا ''گلشن'' کو اپنی الماری میں سجایا، پھر تمام کتابیں الماری میں قرینے سے لگائیں۔ اصل بدھنا واپس باورچی خانے میں رکھا اور پیتل کے لوٹے کو حسرت سے دیکھ کر واپس رکھ دیا۔

دو دن بعد شہاب الدین کی بیٹی،جنت گھر سے جدا ہونے کے لئے سب سے

ملی۔ حیرت انگیز طور پر دادی اماں بہت سنجیدہ اور خاموش تھیں، آنسو بہہ رہے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ایک بڑے حادثے نے انکی عقل ماؤف کر دی تھی۔ نہ وہ ہمیشہ کی طرح چیخ رہی تھیں، نہ ہی رو رہی تھیں۔ جب دولہا دلہن سب سے مل چکے تو دادی اماں نے پُر وقار طریقے سے، باہوش وحواس حضرت امیر خسرو کے الفاظ دوہرائے:

''کاہے کو بیاہی پردیس لکھی بابل مورے

آج بابا نے ہارے ہیں بول لکھی بابل مورے

کاہے کو بیاہی پردیس لکھی بابل مورے

سب زاروقطار رونے لگے۔ سب نے دلہن کو بوسہ دیا اور جنت بابل کا گھر اُجاڑ کر پردیس روانہ ہوئی۔

BOAC کے جہاز میں سفر کے لئے میاں بیوی جہاز میں بیٹھے اور جنت نے بیٹھتے ہی سوال کیا۔ ''اس میں غسل خانہ ہے نا؟''

''کیا غسل واجب ہے''

''نہیں نہیں پیشاب آئے گا تو کیا کریں گے۔ لوٹا تو ہم لائے نہیں!''

''وہ دیکھو جہاں Toilet لکھا ہوا ہے نا! وہاں چلی جانا اور سب ٹھیک ہو جائے گا''

جب جہاز نے زمین چھوڑی تو جنت نے کھڑکی میں سے جھانکنا شروع کر دیا اور پوچھا ''دِلّی کہاں ہے؟ یہاں تو درخت ہی درخت نظر آ رہے ہیں''۔

جواب ملا ''دِلّی دُور است'' اور دِلّی دُور ہوتی گئی۔ جہاز اُڑتا رہا۔ بادلوں کے گولے کھڑکی میں سے گزرتے نظر آنے لگے۔ جہاز اوپر نیچے ہوتا ہوا بلندی حاصل کرتا گیا۔ سامنے لکھے ہوئے الفاظ Fasten Seat Belts غائب ہو گئے۔ کٹ کٹ کی آوازوں کے ساتھ سب مسافر اپنی جہاز کی سیٹوں سے آزاد ہو گئے۔ کچھ کھڑے ہو

گئے۔

جنت: ''میں اس کمرے کے راز جاننا چاہتی ہوں جس پر لکھا ہے "Toilet"

''جاؤ، جاؤ۔ شائد لوٹا رکھا ہو۔ فارغ ہو کر آنا''

چھوٹے سے دروازے پر لکھا ہوا تھا "Vacant" جنت نے ڈرڈر کر آہستہ آہستہ دروازہ کھولا اور جھانکا کہ کوئی گورا تو گھسا ہوا نہیں بیٹھا۔ جب اسے احساس ہوا کہ وہ کمرے میں اکیلی تھی تو دروازہ بند کر لیا۔ چاروں طرف شیشے لگے ہوئے تھے اور اچھی خوشبو آرہی تھی۔ بڑے آئینے میں دلہن نظر آئی۔ شادی کے بعد جنت نے اپنے اوپر پہلی بار بھرپور نگاہ ڈالی۔ منہ سے نکلا ''ارے جنت تم؟ تم یہاں ہوا کے دوش پر کیا کر رہی ہو؟'' اس نے اپنا سنگار دیکھا اور مزید دیکھنا چاہا اور دوپٹہ فرش پر گرا دیا۔ تھوڑا سا گھوم کر اپنا حُسن دیکھا۔ ایک کلی گلاب کا پھول بنتی نظر آئی۔ وہ مسکرائی، ہنسی اور شرما گئی۔ سامنے چھوٹی الماری میں خوشبو کی بوتل رکھی نظر آئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر اپنے ہاتھ پر خوب چھڑکی۔ اپنی بغل میں بھی چھڑکی۔ اپنے آپ کو چور قرار دیتے ہوئے بوتل واپس رکھ ہی رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور ایک بوڑھے انگریز نے اندر گھسنے کی کوشش کی۔ جنت نے ''ہائے اللہ'' کہہ کر فرش سے اپنا دوپٹہ اٹھایا۔ اُدھر انگریز "Oh! I am sorry!" کہہ کر غائب ہو گیا۔ جنت نے سوچا کہ ایک آزاد ملک جانے کا پہلا تجربہ ہے۔ شاید جہاز کے Toilet میں ایک وقت میں دو مسافر سما سکتے ہوں۔ جب دروازے کی کنڈی کو دیکھا تو لکھا ہوا تھا "Open"۔ احساس ہوا کہ جنت نے دروازہ بند ہی نہ کیا تھا۔ اس نے دروازے کو اچھی طرح لاک کیا تو Open "Locked" میں تبدیل ہو گیا۔ جنت نے اب اطمینان سے جائزہ لینا شروع کیا کہ اگر پیشاب آئے تو کیا کاروائی کرنی ہوگی۔ وہاں کوئی کھڈی نہ تھی، نہ ہی کوئی زنجیر تھی جسکو کھینچ کر پانی بہایا جا سکے۔ ایک چمکیلا تسلہ تھا جس پر پلاسٹک

کا گھیرا بنا ہوا تھا۔ اس پر بیٹھ کر کام کیا جا سکتا تھا مگر...مگر لوٹا تو تھا نہیں۔ ''ہائے اللہ میں پیشاب کو کیسے روکوں گی''۔ جنت نے Toilet کا دروازہ کھولا اور تیزی سے اپنے شوہر کے برابر والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ ''دیکھئے دیکھئے وہ تسلہ سا بنا ہوا ہے اس چھوٹے سے کمرے میں۔ اسی پر بیٹھنا ہے نا؟ مگر زنجیر تو ہے نہیں۔ اس کو بہاتے کیسے ہیں، نہ لوٹا نہ پانی''۔ ''جہاں تسلہ سا بنا ہوا ہے نا اس کے پیچھے ایک ہینڈل ہے۔ اس کو مروڑ دو تو زنجیر کا کام کرے گا۔ وہاں چھوٹی چھوٹی الماریاں بنی ہوئی ہیں۔ ان میں کاغذ کے تولیے اور رول رکھے ہوئے ہوں گے۔ ان کو پانی کی جگہ استعمال کرو اور ہاتھ بیسن میں دھو لو''

''یہ کام مشکل ہے۔ہم زمین پر کب اُتریں گے؟''

''کیا زور کا آ رہا ہے؟ اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے وہ کام نہ کر دینا!''

''نہیں آ نہیں رہا مگر آئے گا تو کیا کروں؟''

تھوڑی دیر میں کھانا آیا۔ تب تک تمام گورے ہم سفر ایک دوسرے کے چہروں سے مانوس ہو چکے تھے۔ جہاز گھر بنتا جا رہا تھا۔ چھ گھنٹے کے بعد جہاز قاہرہ ائیر پورٹ پر اُترا اور پھر دوبارہ سفر جاری کر کے آخر کار جہاز نے لندن کے ہیتھرو پہنچنے کا اعلان کیا۔ زندگی کا ایک اور سفر ختم ہوا اور نئے ملک، نئی فضاؤں میں، دو زندگیوں نے نئے عہد و پیمان کے ساتھ وہ دَور شروع کیا جس کو ہنی مون کہا جاتا ہے۔

لندن

لندن کے ہیتھروائیرپورٹ پر جمال پاشا اپنی انگریز نژاد بیوی عینی (Annie) کے ساتھ دولہا دلہن کو خوش آمدید کہنے کو تیار تھے۔ پھولوں کے گلدستے لئے ایک نئی دلہن کا تصور کئے اِدھراُدھر دیکھ رہے تھے کہ کمال نے آواز دی ''بھائی جان''۔ تیزی سے میزبان، آواز کی طرف بھاگے اور دونوں بھائی ایک دوسرے کے بغل گیر ہو گئے۔ جذبات نے خاموشی کے ساتھ دونوں بھائیوں کو چمٹائے رکھا۔

کمال: ''بھائی جان، جنت سے ملیئے'' جمال آگے بڑھے اور اپنی بھابی کو رسماً بوسا دیا۔

کمال: ''جنت، یہ بھابی عینی ہیں'' عینی آگے بڑھیں اور جنت کو بوسا دیا اور کہا:

"Welcome to Pasha family, Jannat"

جمال: ''میں اپنی بیوی کو عین سے عینی کہتا ہوں۔ الف سے اینی نہیں کہتا۔ جنت آپ ان کو بھابی جان یا عینی کہہ سکتی ہیں۔ انگریزی میں یہ اپنے نام کے ہجے .A.N.N.I.E سے کرتی ہیں۔ Lord Balsham کے خاندان کی ہیں۔ ہندوستان کی پیدائش

ہیں۔ بچپن دارجلنگ میں گزرا۔ اُردو سمجھتی ہیں مگر اُردو انگریزی میں بولتی ہیں اس وقت یہ میری پوری بات سمجھ رہی ہیں۔ اس مختصر تعارف کے بعد جمال کی اور عینی کی آنکھیں لڑکی پر جم گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے جنت کی شخصیت کا معائنہ کر کے دماغ پر اولین نقوش بنائے جا رہے تھے۔ ''بھئی کمال تمہاری نظر انتخاب کی داد دینی پڑے گی۔ کہاں سے نکالا تم نے یہ ہیرا'' یہ کہہ کر آگے بڑھے اور اپنی اپنی بھابی کی جبیں پر بوسہ دیا۔ عینی نے جنت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"What a pretty girl! Jannat we are proud to receive you and Kamal in London."

جمال نے بتایا کہ وہ کمال کی بیوی سے ملنے کے لئے بے چین تھے اور بے چینی سے اُن کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ پہلی نگاہ میں جنت کو یہ لوگ بہت اچھے لگے۔ ان کی باتوں میں محبت اور خلوص ظاہر ہو رہا تھا۔ بڑی ہمدردی اور عزت سے دولہا دلہن کو خوش آمدید کہا جا رہا تھا۔ ماحول دہلی کے ماحول سے بہت مختلف تھا۔ انکے حرکات وسکنات شریفانہ اور مہذب ماحول کی عکاسی کر رہے تھے۔ جنت کے دل میں اپنے نادیدہ سسرال کا جو خوف تھا وہ پہلی ملاقات ہی میں بھروسے اور اعتبار میں تبدیل ہو چکا تھا۔ کمال بہت دنوں بعد اپنے بڑے بھائی سے ملے تھے۔ وہ بے تاب تھے کہ اپنی شادی کی تفصیلات اپنے بھائی اور بھابی کو بتائیں اور جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتے تھے۔ جب یہ لوگ اپنے گھر پہنچے تو شام کا اندھیرا چھانا شروع ہو چکا تھا۔ جمال لندن سے چیلسی Chelsea کے علاقے میں رہائش پذیر تھے۔ یہ علاقہ لندن کے شرفاء کا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ لندن کے کھاتے پیتے لوگ یہاں رہتے ہیں۔ Oakley Street پر انکا اپنا دومنزلہ کشادہ مکان تھا جس کے پیچھے وسعت تھی۔ سڑک پر تھوڑا سا آگے جائیں تو دریائے ٹیمس پر البرٹ برج کا پُل ہے۔ اسے پار کر لیں تو بائیں طرف دریا کے کنارے خوبصورت Batter Sea Park کے خوبصورت پھولوں کے تختے ہیں۔ دبستان کہہ لیں یا گلستان کہہ لیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قدرت نے جنت کو اپنا ماضی بھلانے کے لئے یہ علاقہ بنایا تھا

اور اُسے ہنی مون منانے کے لئے یہاں اُتارا گیا تھا۔ یہاں جنت کی ہر نعمت جنت کو میسر تھی۔

جب سب لوگ گھر پہنچے تو سفر کی تھکان سے جنت کے سر میں اتنا درد تھا کہ ٹھیک طرح سے بات نہ کر پا رہی تھی۔ اس نے اپنے حالات کا اظہار کیا، ''میری اس وقت پریشانی یہ ہے کہ قاہرہ سے چلے تو رات تھی۔ یہاں پہنچے تو رات ہے، دن کہاں گیا'' اس کی وجہ بتانے کی کسی نے کوشش نہیں کی، صرف اتنا کہا کہ جو لندن آتا ہے اُس کو یہ بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں تھی۔ جنت کو مشورہ دیا گیا کہ وہ کھانا کھا کر فوراً سو جائے اور کل دیر سے اُٹھے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر باتیں کریں گے۔ جمال نے دولہا دلہن کا بیڈ رُوم دکھا کر کہا ''تم دونوں کی بُری حالت ہے۔ غسل کر کے کھانا کھاؤ اور سو جاؤ۔ کھانا تیار ہے۔ ہم تمہارا انتظار کریں گے''۔

ہوائی سفر سے جنت کے بال چکٹ چکے تھے۔ اس نے اپنے بالوں کو سونگھتے ہوئے اپنے میاں سے کہا ''اس سفر سے تو میرے بال نمدہ بن گئے ہیں۔ میں پہلے غسل خانے جاؤں گی۔ شیمپو ہے نا؟'' اور یہ کہہ کر جنت غسل خانے میں چلی گئی۔ غسل خانہ کیا تھا، شیش محل تھا۔ ہر طرف آئینے لگے ہوئے تھے۔ ''اس کو اتنا بڑا بنانے کی کیا تُک تھی؟'' ہر چیز اجنبی لگ رہی تھی۔ ایک کونے میں مختلف شکلوں کی اور مختلف رنگوں کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ شیمپو کی بوتل نہ تھی۔ نہ ہی آملے تھے اور نہ ہی سیکا کائی۔ پریشانی میں اپنے میاں کو آواز دی۔ ''سُنئے! یہاں آیئے پلیز! شیمپو کہاں ہے؟'' کمال آئے، شیمپو کی بوتل دکھائی۔ جنت نے دروازہ بند کیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آواز آئی، ''سُنئے، یہاں آیئے پلیز! ٹونٹی کا پانی کیسے کھولتے ہیں، یہ تو عجیب سے ہینڈل لگے ہوئے ہیں''۔ کمال نے ٹونٹی کا پانی کھولنا سکھایا اور دروازہ بند کیا۔ پھر آواز آئی ''سُنئے! یہاں آیئے پلیز۔ شاور میں پانی نہیں آ رہا۔ شاور کیسے کھولتے ہیں پلیز''۔

/

ابھی لندن آئے کچھ ہی گھنٹے ہوئے کہ جنت کو میر ورد روڈ کے کوارٹروں کی زندگی کا اور لندن کی زندگی کا فرق محسوس ہونا شروع ہو گیا۔ وہاں غسل خانے کی ٹونٹی پر کپڑا بندھا ہوتا تھا کہ چھینٹیں نہ پڑیں۔ یہاں انداز غسل مختلف تھا۔ میاں بیوی تیار ہو کر نیچے آئے تو کھانا میز پر لگ چکا تھا۔ کھانے کے لوازمات اُن کے تصور سے بہت مختلف تھے۔ میز پردیسی کھانا لگا ہوا تھا! بریانی کے ساتھ قورمہ اور شامی کباب اور رائتہ دیکھ کر تو اُن کی بھوک کھل گئی۔ صاحب خانہ جمال نے کہا کہ تم دونوں رَج کے کھاؤ تے جان بناؤ۔ باتوں سے بھوک خراب نہ کرو۔ وقت کی پکار بھی یہی تھی۔ جہاز میں جو کچھ بھی ملا تھا وہ انگریزی ذات کا معلوم ہوتا تھا۔ نہ مرچیں، نہ مزہ، نہ دہی۔ پتہ نہیں کہ سؤر کا گوشت کس کس میں ملا ہوا تھا۔ سچ پوچھا جائے تو سفر میں تو گزارا پھلوں، ڈبل روٹی اور میٹھے پر ہوا تھا۔ کھانا شروع ہوا۔ لقموں کی رفتار غمازی کر رہی تھی کہ مسافر واقعی بھوکے تھے۔ جب کھانا ختم ہونے کو آیا تو کمال کے منہ سے صرف اتنا نکلا'' بھوکے مسافروں کو کھانا کھلانے کا بڑا ثواب ہے بھائی جان''۔ جمال نے اپنے بھائی کے ریمارکس کا ترجمہ اپنی گوری بیوی سے کیا اور اعلان کیا کہ مسافروں کی حالتِ زار دیکھتے ہوئے کھانے کے بعد کوئی بات وات نہیں ہوگی۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ سب سوئیں گے۔ صبح باتیں ہوں گی۔ جنت پہلے ہی اپنے آپ کو سنبھال نہ پا رہی تھی اور کمال کی حالت بھی پتلی تھی۔ اپنے بڑے بھائی کا حکم غنیمت جانا، اوپر کا راستہ لیا اور جا کر دونوں سو گئے۔

دوسرے دن گیارہ بجے تک مہمان خانے سے کوئی آواز نہ آئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کمرے میں کوئی باسی تھا ہی نہیں۔ بارہ بجے سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دلہن نیچے اُتریں اور گھر کی لے آؤٹ کو سمجھتی ہوئی جنت پکڑی گئیں۔ پیچھے سے خاتونِ خانہ بولیں:

"Hello Janat, you had good sleep?"

"We slept like logs. Oh,what a fatigue. But we are OK. My husband should be coming down in a minute"

اب تو دوپہر کے کھانے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ناشتے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ یمنی نے برنچ تیار ہونے کا اعلان کیا اور دولہا دلہن ناشتے کے لوازمات کے ساتھ کھنی ہوئی کھچڑی دیکھ کر بلا تکلف کھانے پر بیٹھ گئے۔ کھانے پر جمال نہ تھے۔ وہ اپنے دفتر جا چکے تھے۔ یمنی نے مہمانوں کی خاطر تین دن کی چھٹی لے رکھی تھی۔ اس کو احساس تھا کہ لندن میں نو واردوں کو کافی مشکلات کا سامنا ہوگا، خاص طور پر ایک دقیانوسی خاندان کی لڑکی کو۔ انہوں نے آج کا دن دولہا دلہن کو مشورہ دینے کے لئے مختص کر رکھا تھا تاکہ شروعات ہی میں انکو صحیح راہ پر ڈالا جا سکے۔

یمنی نے مشورہ دیا کہ باہر قدم نکالنے سے پہلے وہ اپنے راستوں کا قبلہ سیدھا کر لیں اور نقشوں پر سمجھ لیں کہ وہ کہاں ہیں اور ان کو کہاں جانا ہے۔ یمنی نے سات نقشوں کا سیٹ نکالا اور کمال کے سامنے ڈال دیا۔

پہلا تھا لندن اور اس کے گرد و نواح کا نقشہ

دوسرا تھا لندن کا نقشہ

تیسرا تھا لندن کی ٹرین سروس کا نقشہ

چوتھا تھا لندن کی انڈر گراؤنڈ ٹرین سروس کا نقشہ

پانچواں تھا لندن کی بس سروس کا نقشہ

چھٹا تھا لندن کی شبینہ بس سروس کا نقشہ

ساتواں تھا لندن کی شوپنگ مالز کا نقشہ

یمنی نے صاف لفظوں میں بتایا کہ اگر ان نقشوں پر مہارت نہیں پائی گئی تو لندن کے گلوں میں گزر نہیں ہو سکے گا۔ یہ نقشے وفادار اور خاموش راہ نما ہیں۔ ان کے بغیر لندن میں کار چلانا بھی مشکل ہے۔ ان نقشوں کو پڑھنا آسان ہے۔ ان کو سمجھنا ضروری ہے۔ جنت کو اور کمال کو انکی بھابی نے مشورہ دیا کہ ان نقشوں کا اچھی طرح سے مطالعہ کر لیں۔ اپنی

موجودہ جائے وقوع کو اچھی طرح سے دیکھ لیں۔ جو باہر سڑک ہے اس کو اچھی طرح سے نقشے پر دیکھیں اور پھر باہر نکل کر دیکھیں کہ یہ جگہ نقشے پر کیسی لگتی ہے اور زمین پر کیسی لگتی ہے۔ یمنی نے مزید شفاف الفاظ میں آگاہ کیا کہ وہ، یا ان کے شوہر جمال، اپنی کار میں ان کو سیر نہ کرا سکیں گے۔ کوئی کمال کے ساتھ رہبر بن کر نہیں جا سکے گا۔ دولہا دلہن نقشے لے کر باہر نکلیں اور جہاں دل چاہے جائیں۔ بسوں کا اور ریل کا جال اتنا اچھا ہوا ہے کہ ایک انسان کہیں سے کہیں بھی جا سکتا ہے۔ نقشے رہبر ہیں اور قدم قدم پر سڑکوں کے انتظار اور گلیوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ آزادانہ جہاں دل چاہے جائیں۔ گائڈ کا انتظار نہ کریں۔ یمنی نے یہ بھی مشورہ دیا کہ پہلا دن نقشوں کو سمجھنے میں صرف کریں۔ سفر کی تھکان اچھی طرح سے اُترنے دیں اور دوسرے روز نقشوں کی رہنمائی میں سیر کے واسطے نکلیں۔ جہاں دل چاہے جائیں۔

جنت کے لئے تجربوں کا نیا باب کھلا۔ یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ صحیح الفاظ میں کارآمد باتیں بتائی گئیں۔ نہ تکلف کا عنصر نہ چکنی چپڑی باتوں کا بگھار۔ نہ غیر ضروری باتوں کا ہجوم۔ بالکل صاف الفاظ میں اجنبیوں کے واسطے سنجیدہ رہنمائی دی گئی تھی۔ جنت کو یہ انداز رہنمائی پسند آیا اور وہ نقشے کھول کر بیٹھ گئی۔ کچھ نقشوں میں تو نقشے جیسے نقوش بنے ہوئے تھے، دریا تھا، سڑکیں تھیں، پارک وغیرہ تھے لیکن کچھ پر تو رنگین لائنوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ جگہوں کے نام دئے ہوئے تھے۔ لال، سبز، پیلی، نیلی لائنوں سے گراف ٹائپ کا کوئی نقش بنایا گیا تھا۔ اس نے سب نقشے فرش پر پھیلا لئے اور سسٹم کا مطالعہ شروع کر دیا۔

کمال: ''جنت ادھر آؤ میں سمجھاؤں''

جنت: ''نہیں، نہیں ابھی نہیں۔ مجھے خود سمجھنے دیں کہ یہ سسٹم کیا ہے۔ فی الحال مجھے اپنے حال پر چھوڑ دیں''

جنت نے ہر ایک نقشہ علیحدہ علیحدہ سمجھا۔ پھر سب نقشوں کے اور لیپ کو دیکھا۔ ہر نقشے پر وکٹوریہ سٹیشن دیا ہوا تھا۔ کسی پر ایک حالت میں اور دوسرے پر دوسری حالت میں لیکن ہر مقام اپنی اپنی جگہ پہچانا جا سکتا تھا۔ سسٹم ابھرنے لگا۔ نقشوں پر دی ہوئی سکیل سے فاصلوں کا اندازہ ہو گیا۔ جنت کو احساس ہونے لگا کہ وہ لندن میں ہے اور لندن میں کس جگہ پر ہے۔ اور دو گھنٹے کے مطالعہ کے بعد وہ کھڑی ہوئی اور اپنے بھروسہ کا اعلان کیا:

I think I am much wiser girl than I was two hours before. I am now confident that I can move around in London.

پانچ بجے کے قریب جمال دفتر سے واپس آئے۔ چاء پر باتوں کا دفتر کھلا۔ کمال شادی کی تفصیلات سنانے کے لئے اور جمال تفصیلات سننے کے لئے بیتاب تھے۔ باتوں کا مرکزی عنوان جنت پر گردش کرتا رہا تھا۔ کیا پتا پڑی کہ کمال نے اپنے سے اتنی چھوٹی لڑکی کو اپنے نکاح میں لے لیا تھا۔

ساری داستان جمال اور بینی نے بڑے غور سے مگر حیرت سے سنی۔ کبھی حیرت سے انگشت بدنداں تھے اور بار بار کہتے تھے کہ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے"۔ کبھی جنت کی غیر معمولی روشن دماغی پر رشک کرتے اور کبھی خوش ہوتے کہ ایسی ہستی ان کے خاندان کا نام روشن کر سکتی تھی اور کبھی خاموشی سے جنت کے حسن اور اس کی عمر کو دیکھ کر کہتے کہ یہ شاہین ایک پنجرے میں بند تھا۔ اس کو اپنی قوت پرواز کا ابھی احساس نہیں۔ جس روز احساس ہوگا، یہ چٹانوں پر جا کر بسیرا کرے گا۔ باتوں کے اختتام پر جمال کو اور بینی کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ بہت کچھ کر سکتے تھے اور جنت کو ایک اعلیٰ مقام پر پہنچانا ممکن تھا۔

شام کے کھانے کے بعد بھی واقعات گوئی کا سلسلہ جاری رہا اور مرکز ذکر اور مرکز توجہ یہی لڑکی رہی، جنت کہیں جسے۔ اس کی مستقبل کی تعلیم بھی زیر بحث رہی۔ جمال اور انکی اہلیہ بینی غور سے باتیں سنتے رہے اور اس نوجوان لڑکی کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان دونوں کا مشترکہ خیال تھا کہ اگر جنت کا .I.Q اتنا بلند ہے جیسا کہ بتایا جا رہا

ہے تو انگلینڈ جیسی جگہ میں وہ بہت کچھ کر سکتی تھی اور اس کا مستقبل تابناک ہو سکتا تھا۔ بینی لندن کے کالج ''یونیورسٹی کالج'' میں پروفیسر کی حیثیت سے پڑھا رہی تھی۔ جنت کی تعلیم کے بارے میں مخلص رائے دے سکتی تھی۔ پاشا خاندان کو کبھی روپے پیسے کی کمی نہ ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ جمال بذاتِ خود ایک انگلش بینک کے وائس پریزیڈنٹ تھے اور اپنے سوشل گروپ میں نمایاں مقام حاصل کر چکے تھے۔

یہ تمام باتیں سننے کے بعد جنت کو امید کی کرن نظر آنے لگی۔ اس کے شوہر کمال نے جو اس کی حبس بے جا کے دوران وعدہ کیا تھا کہ وہ شادی کے بعد اسکی اعلیٰ تعلیم کا ذمہ دار ہوگا، آج وفا ہوتا نظر آرہا تھا۔ جنت پہلے تو زیرِ لب مسکرائی پھر تبسم کا دھارا نمایاں طور پر کھل پڑا۔ کہنے لگی ''یا اللہ، یہ کیا مقام ہے۔ دُنیا میں ایسے لوگ کہاں چھپے ہوئے تھے؟'' جنت کی خوشی کو دیکھ کر بینی بولیں:

"Jannat, I would like to warn you that your current academic year has already been wasted, But this also goes in your favour. Make best use of this period. Do not make hasty decision. Go around and see for yourself what is best for you. It is you who has to make a decision. I will help you and support you in every way. I think you can make a good grade."

جنت نے پھر اوپر دیکھا ''اللہ میری مدد کرتا''۔

جمال: ''میں آپ لوگوں کی توجہ گھڑی کی طرف لانا چاہتا ہوں۔ کیا ارادہ ہے، بارہ بج چکے ہیں، نیا دن شروع ہو چکا ہے اور کل دفتر بھی جانا ہے۔ شب بخیر۔''

لندن میں پہلا قدم

میاں بیوی کو ہنی مون پر لندن آئے چالیس گھنٹے گزر چکے تھے اور ابھی تک گھر سے باہر قدم نہ نکالا تھا۔ آج ناشتے کے فوراً بعد باہر نکلنے کا پروگرام بن چکا تھا۔ جنت نقشوں کا مطالعہ کر چکی تھی مگر اس کو یہ پتہ نہیں تھا کہ باہر سڑک کی شکل کیا تھی اور نقشہ پر اور زمین میں کیا فرق تھا؟ صرف تین نقشوں کو سنبھالتے ہوئے کمال پاشا اور جنت کمال گھر سے باہر نکلے۔ اگست کے مہینے میں لندن کا موسم خوشگوار ہوتا ہے، سردی نہیں ہوتی اور اسی مناسبت سے جنت نے ساڑھی پہنی اور ہلکا سا کوٹ کندھے پر ڈال لیا۔ ابھی گھر سے باہر قدم ہی رکھا تھا کہ نہایت خوشگوار فضا نے خیر مقدم کیا۔ ہوا کا ہلکا سا سرد جھونکا گالوں کو چھوتا ہوا گزرا اور مژدہ سنایا کہ یہاں لو نہیں چلتی۔ فضا صاف تھی اور ہر شے خوش نظر آرہی تھی جیسے کوئی بے جے وقتی کا الاپ کر رہا ہو۔ فٹ پاتھ پر جنت رُک گئی اور لمبے لمبے سانس لے کر اوپر دیکھا۔ ہلکے سے بادل چھائے ہوئے تھے۔ جنت بولی "بہت مختلف جگہ ہے، اگر دلی میں ایسا موسم ہوتا تو فائن ڈے کی چھٹی ہو جاتی"۔ "اب کونسا چھٹی نہیں ہے۔ اچھا دیکھو

مجھے اتنا یاد ہے کہ سامنے اگر ہم جائیں تو Kings Road آتی ہے۔ یہ بڑی سڑک ہے وہیں سے آگے کی ٹیوب اور بسیں مل سکتی ہیں۔ نقشہ نکالو"۔ جنت نے نقشہ نکالا اور اپنی جگہ کو نقشے پر دیکھا۔ "ٹھیک ہے، Kings Road چلتے ہیں۔ یہ تو بہت نزدیک معلوم ہوتی ہے۔میاں بیوی نے جلدی جلدی قدم اُٹھانے شروع کئے۔ سو گز ہی چلے ہوں گے تو کنگز روڈ آگئی۔ یہ کافی چوڑی اور اہم سڑک معلوم ہوئی۔ اس پر یہ ہنی مون جوڑا خوشی خوشی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتا گیا۔ خوشگوار موسم، شفاف فضا، نہ گرمی نہ سردی، نہ دماغ میں کوئی فکر۔ کبھی کبھی خیال آتا تو صرف اتنا آتا کہ "مستقبل کہاں ہے؟"۔ پھر ہمزاد تسلی دیتا "یہیں کہیں ہوگا! جائے گا کہاں؟ مل جائے گا"۔ سڑک کے دوسری طرف بڑی دکانیں نظر آئیں۔ کمال نے ادھر اودھر دیکھا، سڑک پر کوئی ٹریفک نہ تھا۔ اس نے جنت کا ہاتھ پکڑا اور دونوں سڑک کراس کر، کر، کرنے والے ہی تھے کہ اسکریچ ش،ش،ی کی آواز کے ساتھ ایک کار ان کے قریب آ،آ،آ، آ کر رُک ہی گئی۔ جنت کے منہ سے نکلا "کیا بات ہے کار چلانی نہیں آتی؟" پتہ نہیں کہاں ایک پولیس مین چھپا بیٹھا تھا، وہ سیٹی بجاتا ہوا کمال کی طرف بڑھا اور بڑے اطمنان سے کہا:

"Sir, you crossed the road dangrously. I am afraid I have to give you a ticket. You can cross a main road like King's Road on a Zebra crossing only. Please pay 50.00 Pounds at this address. Can I see your I.D., please"

گھر سے نکلنے کے آدھ گھنٹے کے اندر دولہا دلہن کا چالان ہو چکا تھا۔ جنت بہت پریشان ہوئی اور اپنے میاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی "ہوشیار باش، شاید کہ پلنگ خفتہ باشد!"۔ یہ میاں بیوی کی لندن میں پہلی ٹھوکر تھی۔ آگے چلے۔ صاف ستھری سڑکیں، نہ کوڑا نہ کرکٹ، پتہ نہیں لوگ سگریٹ، بیڑی، ماچس، چوکلیٹ کے کاغذ، پُڑیا کے کاغذ کہاں پھینکتے ہیں۔ دکانوں کے شیشے صاف ستھرے۔ اچھی اچھی نادر چیزیں

دکانوں کے شوکیسوں میں سجی ہوئی تھیں۔ لڑکیاں خوبصورت لباس پہنے ہوئے پوز بنا بنا کر اپنا حسن دکھا رہی تھیں۔ کسی کا منہ کھلا تو کھلا کا کھلا ہی رہ گیا تھا۔ کوئی جھکی تو جھکی کی جھکی رہ گئی تھی۔ کسی کا سر ہی نہ تھا، وہ صرف اپنا جوبن دکھا رہی تھی۔ جنت نے ان سب کٹھ پتلیوں کو شوق سے دیکھا اور اپنے میاں کا ہاتھ پکڑ کر دکان میں لے گئی۔ ''مجھے کوٹ خریدنا پلیز''۔ دکان میں حدِ نظر تک سامان ہی سامان بھرا پڑا تھا لیکن کوٹ نہ تھے۔ کمال نے ایک سیلز مین سے پوچھا کہ خواتین کے کوٹ کہاں رکھے تھے۔ اس نے پہلی منزل کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں پہلی منزل کا راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک کونے میں پہنچے۔ وہاں دیکھا کہ سیڑھیاں تو تھیں مگر متواتر گردش میں تھیں۔ تمام سیڑھیاں اوپر کو سفر کر رہی تھیں۔ تھوڑے فاصلے پر کچھ سیڑھیاں نیچے کی طرف جا رہی تھیں۔ کافی لوگ سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے جا رہے تھے۔ لیکن یہ لوگ چڑھے کیسے؟ سیڑھیاں تو رُک ہی نہیں رہی تھیں۔ جنت پریشان حالی میں اپنے میاں کا ہاتھ پکڑ کر ان سیڑھیوں کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ کمال نے کہا، ''جنت چلتی سیڑھیوں میں قدم رکھنا ہے۔ بس پھر کھڑی رہنا، آؤ'' جنت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ متحرک سیڑھیوں کے سمندر میں چھلانگ لگا دی اور ہانپتی کانپتی ایک سیڑھی پر خیریت سے لینڈ کر گئی۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ سیڑھی اوپر جا رہی تھی اور متواتر جا رہی تھی، رُکتی ہی نہ تھی۔ ''اب کیا کروں''۔ کچھ نہ کرو، جب فرش آئے گا تو اس پر چلی جانا''۔ ''لیکن سیڑھی تو رُکے گی نہیں''۔ اتنی دیر میں پہلی منزل کا فرش نظر آنا شروع ہو گیا۔ جنت نے اپنا دل پکا کیا کہ سیڑھی سے اُترنا لازم ہے ورنہ یہ مشین فرش کے اندر لے جائے گی۔ جیسے ہی فرش نمایاں ہوا جنت نے اللہ مدد کا نعرہ لگایا اور سیڑھی پر سے جمپ لگا دی۔ صحیح سلامت فرش پر آ کر گری۔ بٹوہ ہاتھ سے چھوٹ گیا مگر چوٹ نہ آئی۔ اللہ کا شکر کیا۔ جنت پہلی منزل پر پہنچ چکی تھی۔ اپنے میاں سے مخاطب ہوئی'' یہاں کسی چیز کو چین نہیں، سب متحرک ہیں۔ ارے آپ ترکمان دروازے کی سیڑھیوں کو دیکھیں،

سینکڑوں سال ہو گئے ایک بھی سیڑھی نے ابھی تک بل کرنہ دیا۔ اور یہاں پہ ہر سیڑھی ہر وقت گردش میں ہے۔''

جنت نے ایک کوٹ اس دکان سے خریداا ور مزید سیر کرنے کے لئے وہ اپنے میاں کے ساتھ دکان سے باہر نکل آئی۔ میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھااور کہا''بارش؟ مطلع تو صاف تھا!'' ''نہیں صاف نہیں تھا، بادل تھے''۔ ہلکی ہلکی بارش میں میاں بیوی نکل پڑے۔ دونوں کو بڑا مزہ آرہا تھا۔ ساون یاد آ گیا ''ایسے موسم میں تو اندرسے کی گولیاں کھانی چاہیئے تھیں۔ ترکمان دروازہ ہوتا تو میں پکوان چڑھادیتی''۔ خوشگوار موسم۔ ہاتھ میں نیا خریدا ہوا کوٹ، بےفکر دماغ، مستقبل پر اعتماد اور قدم قدم پر نیا تجربہ۔جنت کو، جنت کی سیر پہ لئے چلا جارہا تھا۔ وہ ابھی اس سفر سے آشنا ہی ہوئی تھی کہ اسے چھینک آئی اور سردی سی لگی۔ جنت کی ساڑھی بھیگ چکی تھی۔ پلّو گیلا ہو چکا تھا۔ بال گیلے تھے''سنئے، سردی لگ رہی ہے، میرا کوٹ ذرا ٹھیک طرح پہنا دیجئے''۔ کمال نے اپنی بیوی کے بالوں کو جتنا خشک کرسکتے تھے کیا اور کافی پینے کے لئے ایک ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ لنچ کا وقت ہو چکا تھا۔ بہتر یہی سمجھا کہ اگلا تجربہ حاصل کرنے سے پہلے پیٹ پوجا کر لی جائے۔ اگر پیٹ بھرا ہوا ہو تو تجربہ بھی کامیاب ہوگا۔ دونوں لنچ کے دوران نقشہ دیکھتے رہے۔ انڈر گراؤنڈ South Kensington کا سٹیشن نزدیک معلوم دیا۔ جنت کا اندازہ تھا کہ وہ ۲۰ منٹ کی چہل قدمی کے بعد وہاں تک پہنچ جائیں گے۔ کمال نے اس بات کی تعید کی اور وہاں تک پہنچنے کا پروگرام بنا کر دونوں ریسٹورنٹ سے باہر نکلے۔ بارش رُک چکی تھی، دھوپ بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ ''ارے دیکھئے! موسم بدل گیا۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے، جیسے ساون کے بعد بہار آ گئی ہو''۔ اب دونوں کی منزل ٹیوب کا سٹیشن تھا۔ ان کو احساس ہو گیا تھا کہ جب تک چیلسی میں رہائش ہے South Kensington کے سٹیشن کی مہرابوں

سے گزر کر ہی وہ لندن کے دوسرے مقامات پر پہنچ سکیں گے۔ اس میں گزرنا اور اس میں سے اُترنا زندگی کا معمول ہوگا۔ آج کی منزلِ مقصود وہی سٹیشن بن کر رہ گیا تھا۔ جنت کو کچھ اندازہ نہ تھا کہ ٹیوب کا سٹیشن کس شکل کا ہوتا ہے۔ اس کے شوقِ دیدار میں وہ تیز تیز اپنے میاں سے آگے آگے چل رہی تھی۔ اس نے نقشے پر دو نام یاد کر لئے تھے۔ Sydney Street اور Onslow Square دونوں تیز قدم اُٹھا کر چل رہے تھے۔ سِڈنی اسٹریٹ کے بعد Onslow Square آیا اور سامنے ہی ٹیوب کا اسٹیشن تھا۔

وہاں تو گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ ہر فرد، ہر مرد، ہر عورت، ہر بچہ، ہر کُتا جلدی میں تھا۔ دیر ہوگئی۔ گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ جگہ جگہ چارٹ اور سائن بورڈ مسافروں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ جنت نے کہا کہ یہ سٹیشن آج کی منزلِ مقصود کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے کمال سے کہا "سُنیئے! مجھے سمجھاتے جائیں کہ یہاں ہو کیا رہا ہے؟"۔ کمال نے کچھ سمجھایا، بہت کچھ اس نے اپنے مشاہدے سے اور چارٹ اور نقشوں کی مدد سے سمجھا۔ کھڑے کھڑے اور کبھی چل کر حالات کو سمجھتی رہی اور اپنے میاں سے پوچھ پوچھ کر اپنے شکوک دور کرتی رہی۔ شام کے چار بج چکے تھے دونوں نے اپنے پیروں کا سہارا لیا اور گھر واپس آ گئے۔

شام کی چاء پر جمال اور عینی نے دولہا دلہن کی باہر کی سیر کی تفصیلات پوچھیں۔ دونوں نے لندن میں اپنے پہلے دن کے واقعات سُنائے۔ پولیس مین نے جو ٹکٹ دیا تھا وہ دکھایا۔ کمال نے پوچھا کہ اس کی ادائیگی کیسے ہوگی۔ جمال نے وہ ٹکٹ لیا اور کہا کہ وہ فکر نہ کرے، ہو جائے گی۔ Escalator پر ٹیک آف اور لینڈنگ کا تجربہ، موسم کا حال سُنایا، ٹیوب کے اسٹیشن کی سیر سنائی۔ جمال اور عینی دونوں خوب ہنسے، خوش ہوئے کہ دونوں صحیح راستے پر چل پڑے ہیں۔ جمال نے نصیحت کی "بھائی یہاں لندن میں تین

"W" کا بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے Weather دوسرے Work اور تیسرے Women ۔ ان تینوں سے بچ کر رہنا۔

Annie: "Janat the third W is does not stand for women. It stands for Wolves of London. Two of them are sitting right here."

جمال: ''کبھی یہاں چھتری یا برساتی کے بغیر گھر سے نہ نکلنا۔ کسی کو پتہ نہیں ہوتا کہ کب بارش آ جائے گی۔ دوسرے لندن میں کپڑے یہاں کے موسم کے حساب سے پہنے جاتے ہیں۔ ساڑھی بارش میں مصیبت بن جاتی ہے۔ جنت کو پتلون یا جین سے متعارف کرواؤ۔ یہ کوٹ جو جنت نے خریدا ہے، یہ قیمتی ضرور ہے مگر لندن کی موسمیات کو برداشت نہ کر سکے گا۔ ممی آپ کو کوٹ اور جیکٹ خرید وا دے گی۔ اس کے ساتھ جا کر ایک نیا کوٹ اور خرید ئے گا۔ آج کی پروگرس دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم لوگ صحیح راستے پر چل پڑے ہو۔''

کرسمس

کمال اور جنت کو لندن آئے ہوئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ اب جنت کو لندن پر، لندن کی سڑکوں پر اور یہاں کی بسوں اور یہاں کے عوام پر اعتبار ہو چکا تھا۔ اب وہ تن تنہا لندن کے کسی مقام پر وقتِ مقررہ پر پہنچ سکتی تھی۔ یہاں کی یونیورسٹی اور "یونیورسٹی کالج دیکھ چکی تھی۔ تمام اہم مقامات کی سیر کر چکی تھی۔ یہاں کی آزاد فضا نے جنت کے دماغ اور اندازِ فکر پر اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ حق شناس اور صاف گو ہوتی جا رہی تھی۔ "نمبرون لندن" پر ڈیوک آف ولنگٹن کا میوزیم دیکھ کر نا خوش باہر نکلی۔ وہاں ٹیپو سلطان کی شمشیر دیکھی۔ اس پر تختی لگی ہوئی تھی "Sword of Tippu Sahib" جنت نے اپنی تاریخ کے علم اور جذبات کا اظہار اپنے شوہر سے ایسے کیا" کاش انگریز اس مردِ مجاہد کی عظمت کو سمجھ کر اس تلوار کو وہ عزت دے سکتے جس کی وہ حقدار تھی۔ یہ وہ تاریخی شمشیر تھی جو شہادت کے وقت سلطان ٹیپو کے ہاتھ میں تھی اور کئی انگریزوں کو موت کی گھاٹ اُتار کر عظیم سلطان کو شہادت کا جام پینے دیا تھا۔ اور وہ دیکھئے نپولین کے ماربل مجسمے کو، نپولین کا بالکل برہنہ مجسمہ بنایا ہے؟ بہادر اپنے مرے ہوئے دشمن کی عزت کرتے ہیں۔ یہ انگریز کس قسم کی چیز ہیں؟"

جمال کے گھر، رات کے کھانے سے پہلے عام طور پر ایک نشست ہو جاتی تھی جس میں صاحب خانہ جمال مرکزی رول ادا کیا کرتے تھے۔ اس نشست میں روزانہ کی کارکردگی اور مشکلات پر تبصرہ ہوتا اور ان کا حل تلاش کیا جاتا۔ ماحول نہایت پرسکون اور ہمدردی سے بھر پور ہوتا تھا۔ کمال اور جنت نے اس میٹنگ کا نام '' کانفرنس'' تجویز کیا۔ یہ نام سب کو پسند آیا اور اس کانفرنس کا بے چینی سے انتظار کیا جانے لگا۔ ایک دن جمال نے سب کو یاد دلایا کہ ان کے بھائی اور بھابی کو آئے ہوئے مہینے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ بڑی خوشی کی بات تھی کہ نو وارد جنت توقع سے زیادہ لندن کے ماحول میں سیٹ ہو چکی تھی۔ اس نے ساڑھی پہننی چھوڑ دی تھی، عام طور پر جین یا پتلون پہنی جا رہی تھی۔ دوپٹہ غائب ہو چکا تھا۔ جنت کی کارکردگی پر اس کی بھابی زیادہ خوش تھیں۔ انکو بالکل توقع نہ تھی کہ اتنے دقیانوسی خاندان کی مصیبت ماری لڑکی ایسی اچھی طرح اپنے آپ کو نئے ماحول کے قالب میں ڈھال لے گی۔ ایک دن '' کانفرنس'' کے دوران اینی نے جنت سے بالواسطہ پوچھا کہ ایک ماہ کی سیاحی کے بعد جنت نے اپنی تعلیم کے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟ وہ اس سوال کا پہلے ہی انتظار کر رہی تھی فوراً بول اٹھی کہ وہ کیمبرج یا کسی اور جگہ تعلیم شروع کرنا نہ چاہتی تھی۔ وہ لندن میں رہ کر تعلیم شروع کرنا چاہتی تھی اور ماسٹرز کرنا چاہتی تھی۔ فارسی زبان سے آشنا تھی۔ قرآن شریف پڑھ پڑھ کر کچھ عربی زبان کا تعارف ہو چکا تھا۔ اُردو مادری زبان تھی۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن کو اور دقیانوسی روایات اس کے خون میں گردش کر رہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ Oriental Languages کے سبجیکٹ لے تو زیادہ کامیاب رہے گی۔ لیکن ابھی تک پکا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ وہ سنجیدہ مشورے کی کمی ابھی تک محسوس کر رہی تھی اور اپنی بھابی کے مشورے کی منتظر تھی۔

Annie: " I suggest , you join University College on Bloomsbury on Gower Street. It was founded in 1826 by supporters of religious liberty

to provide higher education in literature and arts. In 1878 it became the first college in UK to allow female students to sit for degrees. It is said that Hitler considered to keep his Head Quarter in Monolithic Senate House of this college, in the event of a British defeat in the World War II. Poor Hitler! Now you go and occupy it."

جنت سوچتی رہی، سوچتی رہی، پھر بولی:

Jannat: "Bhabi Jan, every thing sounds so good and wonderful. I am thankful to you for providing us such valuable information. We would have been ignorant of such facts without your help. But ..... But, Bhabi Annie, admission in such an institution should be very difficult."

Annie: "Oh, Oh, yes. But we can try."

جمال: ارے جنت، انکے وہاں پر بڑے تعلقات ہیں۔ انہوں نے وہاں پر کچھ عرصہ پڑھایا بھی ہے۔ انکو مکھن لگائے جاؤ، شاید کام ہو ہی جائے۔

جنت نے سُنا تھا کہ مکھن کبھی رائگاں نہیں جاتا۔ چھوٹا ہو یا بڑا، مکھن ہضم کرتا ہے۔ اگر مکھن لگایا گیا اور کام نہ ہوا تو اس کا مطلب ہے کہ مکھن کم تھا۔ اور لگاؤ۔ اور اگر پھر بھی کام نے ہوا تو اس کا مطلب تھا کہ مکھن کی کوالیٹی خراب تھی۔ اعلیٰ درجے کا مکھن لگاؤ اور لگائے جاؤ۔ کام ہوگا اور ضرور ہوگا۔ اس انداز فکر کے ساتھ جنت اپنی بھابی سے، بھابی جان سے، بھابی اینی سے، ڈارلنگ بھابی جان سے اور سویٹ بھابی اینی سے مخاطب ہوتی رہی۔ گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔ برتن دھونا، ویکیوم کلینر سے صفائی، ڈسٹنگ کرنا اور کبھی کبھار حسب موقع کار بھی دھو دینا، اس نے معمول بنالیا۔ کھانے پینے کا سامان خرید لاتی اور کبھی گھر میں بغیر پھولوں کے نہ آتی۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنی بھابی کی عمر گھٹانی شروع کر دی۔ جمال اور اینی تقریباً ایک عمر کے تھے تو اس حساب سے اینی کی عمر ۳۵ سال کے لگ بھگ تھی لیکن جنت نے اینی کو یقین دلانا شروع کر دیا کہ بعض

خواتین ایسی ہوتی ہیں جنکا عہدِ شباب بہت بعد میں شروع ہوتا ہے۔ عینی کو یقین دلایا کہ اس کی عمر ۳۰ سال کے قریب لگتی تھی۔ ایک روز وہ اپنی لاڈلی بھابی کے لئے بازار سے شوخ رنگ کی لپ سٹک خرید لائی اور عینی کے دل میں یہ بات بٹھادی کہ وہ شوخ رنگ عینی کی عمر کے لحاظ سے زیادہ موزوں تھا۔ عینی کو اس بات کا یقین ہوگیا۔ مکھن نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔

ایک روز کانفرنس ہو رہی تھی۔ سب بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ عینی بولیں:

Annie: "I am proud of Jannat. The way she has adapted to our culture is incredible. I want to take her to the University College at Bloomsbury before Christmas and finalize her admission."

جنت نے دل میں نعرہ لگایا'' زندہ باد، مکھن کام کر گیا''

Annie: I have seen her academic records and her dedication to her work. I think she is a very smart girl indeed. Jannat, we are proud to have you in our family."

جمال: '' تالیاں، تالیاں۔ جنت ادھر آؤ'' اور جمال نے جنت کی کشادہ جبیں پر بوسہ دیا۔ اگر عینی تم کو بلومز بری لے گئی تو سمجھو کام ہوگیا۔ انشاءاللہ کام ہو جائے گا۔''

جنت خاموش بیٹھ گئی۔ جذبات نے زبان کو بند رکھا۔ ابھی تو اس کی جوانی شروع ہوئی تھی کہ کیا کچھ دیکھ چکی تھی۔ ایک ایک گھڑی طوفانِ حوادث سے بھرپور تھی اور اب ایک نئی دہلیز پر قدم رکھنے والی تھی۔ دل میں دہراتی رہی'' یا اللہ خیر۔ اللہ مجھے ہمت دیجیو، اللہ میری مدد کرنا۔ ربِ زدنی علما۔''

کمال: '' کیا ہوا، کہاں اتنا کھو گئیں؟''

جنت: '' ہم کو جمال بھائی کا اور عینی کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ وہ ہم لوگوں کے واسطے اتنا کچھ کر رہے ہیں۔ جمال بھائی، کیا بھابی ہماری زبان سمجھتی ہیں نا؟''

جمال: ''ارے ایک ایک لفظ''

یمنی: ''جنت ہم اُردو بولو، تم اُردو بولو۔ جمال، کمال انگلش بولو۔ فکرمت''

جنت: ''جمال بھائی، آپ اس چھوٹے سے خاندان کے سربراہ ہیں اور اس رشتے سے میں آپ سے ایک التجا کرتی ہوں اور اجازت مانگتی ہوں''

جمال: ''ارے بولو جنت۔ ایسی بھی کیا بات ہے''

جنت: ''مجھے بال کٹوانے کی اجازت دی جائے''

جمال: ''تالیاں۔ کمال مبارک، یمنی مبارک۔ یہ اچھی خبر ہے''

کمال: ''ہائے۔ مجھ پر کالی گھٹا کیسے جھوم کر آئے گی؟ لیکن جیسا تم چاہو! کٹوالو بال''

یمنی: ''تم اچھا اور سمارٹ لگو۔ "I will take you to my hair dresser"

جمال: ''میرے خیال سے تم بال زیادہ چھوٹے نہ کروانا اور تمہارے جیسے گورے رنگ پر اگر بال ہلکے سے سنہری ہو گئے تو لندن میں ہزاروں قتل ہوئے پڑے ہوں گے۔ کیوں کمال؟''

جنت: ''آج میں اتنی نئی خوشیوں کے صلے میں قیمتیں پکاؤنگی۔ میں اللہ اور آپ سب کی بہت شکرگزار ہوں۔''

کھانے کی میز پر سب لوگ قیمتیں کا مزہ چکھنے ہی والے تھے کہ ٹیلیفون پر جنت کو بلاوہ آیا۔

Caller: "Guess who?"

Jannat: "Jannat here, who is speaking"

Caller: "Guess who?"

Jannat: "Is that you Marlene? Where are you?"

جنت بے قراری کی حالت میں ولسن خاندان کے حالات پوچھتی رہی۔ ولسن خاندان لندن پہنچ چکا تھا۔ مارلین اپنے خاندان کے ساتھ والتھم اسٹو کے ایک چھوٹے سے

مکان میں مقیم تھے۔ اس کے باپ نے سیکورٹی گارڈ کی نوکری کر لی تھی اور مارلین سیلز گرل کے طور پر ایک اسٹور میں نوکری کر رہی تھی۔ مارلین نے جنت کے مکان کا پتہ پوچھا اور اپنے ٹیلیفون کا نمبر دیا۔ ہفتے کے روز مارلین نے آنے کا وعدہ کیا۔

ہفتے کے روز، صبح کے کوئی دس ہی بجے ہوں گے کہ کسی کے دروازے پر آنے کی گھنٹی بجی۔ جنت بھاگی کہ یہ اس کی سہیلی ہوگی۔ دروازہ کھولا اور ''مارلین'' چیخ کر لپٹ گئی۔ ذرا ٹھہرو، تم جنت ہی ہو نا۔ ارے واہ کیا رنگ نکالا ہے۔ یہ سنہری بال، چٹیا غائب۔ یہ بلاؤز، یہ جین، تم جنت ہی ہو نا؟ دوپٹہ کہاں ہے؟ شلوار کہاں گئی؟ اور دونوں پھر لپٹ گئیں۔ جنت نے اپنی دوست کو اندر لے جا کر سب کا تعارف کروایا۔

کمال: ''جمال بھائی اور یمنی بھابی۔ ہم لوگ اب چھٹی کریں۔ اب جنت ہماری طرف نہ دیکھیں گی۔ ان کی زندگی کا محور اب مارلین ہے۔''

جنت اور مارلین کی اکیلے کمرے میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ سب کا حال پوچھا گیا۔ ہر سہیلی کا حال پوچھا۔ وہ تمام صورتحال بتائی گئی جس کا مارلین کی فیملی کو مائگریشن کے وقت سامنا کرنا پڑا تھا۔ دلی کے سب بازاروں میں اب سب سے اہم بازار ''رشوت کا بازار'' کہلاتا تھا۔ اس بازار میں سے گزرے بغیر کوئی اپنی منزل مقصود تک نہ پہنچ سکتا تھا۔ اور یہ بازار دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ جنت کے دلی چھوڑتے وقت اس کی بنیادیں پڑ رہی تھیں مگر اس کا بزنس تو اب گرم ہوا تھا۔ اس بازار سے گزرتے گزرتے دو ماہ کی تاخیر ہو گئی تھی۔ ماہ نور کا خط مارلین کے پاس لاہور سے آیا تھا۔ وہ جنت کو بہت یاد کر رہی تھی۔ مارلین کے پاس ماہ نور کا پتہ موجود تھا۔ رضوان اپنی ریسرچ کے لئے انگلینڈ آ چکا تھا اور اس کا پتہ بھی مارلین کے پاس موجود تھا۔ دونوں سہیلیوں کے خیالات اور جذبات ہمیشہ سے ایک جیسے رہے تھے۔ اب یہ دونوں اپنے آپ کو سمندر کے کنارے پر کھڑا دیکھ رہی تھیں۔ اس کی لہروں کے تھپیڑوں کو دیکھ رہی

تھیں۔ دونوں کو ان ہی لہروں میں کود کر اپنی منزل پر پہنچنا تھا۔ دونوں کی ہمت ان کے خوف پر حاوی تھی۔

Marlene: I am confident Jannat. We can do it. If you recognize your goal and possess sincere desire to achieve it, you can do it. I can do it.

لنچ کے واسطے دونوں سہیلیاں نیچے آ گئیں۔ سب لوگ ان کا انتظار کر رہے تھے۔ جمال نے دلّی کے بارے میں اور ولسن فیملی کے بارے میں کئی سوالات کئے۔ ہندوستان سے امیگریشن کے بارے میں بہت سے سوال کئے۔ آخرکار انگو، کمال اور جنت کو لندن کا شہری بنانا تھا۔ مارلین سب کے جوابات دیتی رہی، پھر ایک دم اس کو جوش آیا۔ دلّی کی تہذیب نے جوش مارا۔

"Jamal Bhai, with your permission I want to recite a shair in Urdu about India."

جمال: ''ارشاد ارشاد، ہو جائے شعر و شاعری''

مارلین: ہندوستان میں،

پہلے کبھی گھی سے بھاجی بنتی تھی اب بھاجی سے گھی بنتا ہے
پہلے عورت بچہ جنتی تھی اب ساری بھارت جنتا ہے

سب لوگوں نے زور سے قہقہہ مارا۔ اس قسم کا شعر ایک اینگلو انڈین لڑکی کے منہ سے سُن کر احساس ہوا کہ دلّی کے تمدن کا اثر اس لڑکی کے دماغ پر بھی گہرا ہو چکا تھا۔

جمال: ''مارلین، شعر اچھا ہے کیونکہ اس میں بھارت کی عوام کی ترجمانی کی گئی ہے۔ مارلین آپکو لندن کے مشاعرے میں شعر پڑھنے چاہیں۔ واہ واہ، مکرر ارشاد، مزہ آ گیا''

مارلین: ''جنت اس وقت مجھ میں اور تم میں بڑا فرق ہے۔ تم اس وقت ایسے خاندان کی فرد ہو جس میں دولت کی ریل پیل ہے۔ ہم اس وقت پیسے پیسے کو ترس رہے ہیں۔ ڈیڈی چوکیدار بنے

ہوئے ہیں۔ میں سیل گرل کی حیثیت سے چھ گھنٹے کام کر کے چکنا چور ہو جاتی ہوں۔ میری بہن بھی نوکری کر رہی ہے۔ میری ماں نوکری ڈھونڈ رہی ہے۔ میں نے کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔ دن اور رات کالج اور اسٹور میں گزر جاتے ہیں۔ دیکھو کب تک چلتا ہے''

جنت: ''اگر کبھی زیادہ مشکل میں پڑ جاؤ تو مجھے ضرور بتانا۔ شاید مدد کر سکوں۔ تمہارے لارڈ ولسن کا کیا ہوا؟''

مارلین: ''ارے جنت! تم کو معلوم ہے کہ دلّی کی شیخی اور لندن کی حقیقت میں کتنا فرق ہے۔ کون لارڈ! کون لارڈ ولسن؟''

سارا دن گزارنے کے بعد مارلین نے جانے کی اجازت مانگی۔ جنت نے اس کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر دوبارہ چیک کیا اور تاکید کی کہ ماہ نور کا لاہور کا پتہ اور رضوان کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر ضرور جنت کو فراہم کر دے۔ اس وعدے کے ساتھ مارلین کو جنت ٹیوب کے اسٹیشن تک چھوڑنے گئی اور اس کو خیر باد کہا۔

جنت کی زندگی میں اب ٹھہراؤ آتا جا رہا تھا۔ وہ دقیانوسی ماحول سے نکل چکی تھی۔ باتوں میں طعنوں کا تیزاب، فضول اور مہمل گفتگو ختم ہو چکی تھی۔ زحمتِ کلام کے چکنی چپڑی باتوں کا استعمال کوئی نہ جانتا تھا۔ خوتین کا ہاتھ مٹکا مٹکا کر ایسی پُر معنی حرکتیں کرنا کہ سننے والے کے تن بدن میں آگ لگ جائے، اب تصور سے باہر تھا۔ ہاں، بدخوابی کی حالت میں کبھی کبھار دادی اماں کی باتیں یاد آ جاتی تھیں، جنت ضرور چونک کر اٹھتی تھی۔ لندن میں گھر کا ماحول بہت مہذب تھا۔ ہنسی مذاق کافی ہوتا تھا مگر طعنہ زنی اور فحاشی سے پاک۔ خاتونِ خانہ عینی کے پاس ماسٹرز کی ڈگری ''معذوروں کو تعلیم'' کی بھی تھی۔ وہ باتوں باتوں میں اپنے متکلم الیہ کی دماغی کیفیت معلوم کرنے کی ماہر تھی اور باتوں باتوں میں تعلیم دے سکتی تھی۔ جنت کو اپنی بھابی کی یہی بات بہت پسند تھی۔ وہ سوچتی رہتی تھی کہ بھابی کو میرے دل کی بات کیسے پتہ چل جاتی ہے۔

ادھر عینی کو جنت کے I.Q. کا صحیح اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ اس کے دماغی پارینہ نقوش کا مناکرنی

بنیادوں پر ڈالنا چاہتی تھی جس پر جدید تعلیم کے ایوان کھڑے کئے جا سکیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی قابلیت اور اہلیت کو اچھی طرح سمجھنے لگی تھیں اور ایک دوسرے پر مکمل اعتبار کر چکی تھیں۔

ایک دن جنت نے عینی سے بڑا اُلجھا ہوا سوال پوچھا:

"Annie Bhabi, did you ever feel lonely? You have no kids." عینی نے جواب دیا کہ معزوروں کی معزوری کو دیکھ کر اور انکا جذبہ تعلیم دیکھ کر، پڑھانے والا ان کو اپنی اولاد سمجھ بیٹھتا ہے۔ اگر وہ یہ نہ سمجھے تو وہ پڑھا نہیں سکتا۔ میری اتنی اولاد ہے جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ وہ سب مجھے ماں سمجھتے ہیں اور واقعی میں ان کو اپنی اولاد جیسی محبت دیتی ہوں اور ان سے ماں جیسی محبت لیتی ہوں۔ میں سب سے محبت کرتی ہوں۔ پھر عینی نے بھی جنت سے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔ ''جنت کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے؟'' یہ سوال بہت مشکل تھا۔ جنت جھوٹ بولنے کی عادی نہ تھی، وہ سوچتی رہی، پھر عینی نے لقمہ دیا:

Annie: "I know you do not love Kamal!"

جنت خاموش رہی۔

Annie: "You are a grown up girl, married twice. You must have loved some one."

Jannat: "No."

Annie: "Then there must be some one who appears in a romantic way in your dreams. Who is he?"

Jannat: "Bhabi, you are a Psychiatrist. No, Bhabi Annie. I may say .... I may say that one who gave me a new life. He saved me from suicide.

Annie: "How romantic! You are a normal human female. Congratulations. Did you ever try to kill yourself?"

Jannat: "Yes."

Annie: "Jannat, one more advice. It is not the time for you to get

pregnanat. If you do, then let me know. I will do something."

ہوائیں چلتی رہیں اور کیلنڈر کے اوراق کو اُڑاتی رہیں۔ ''کانفرنسیں'' ہوتی رہیں۔ اور ایک کانفرنس کے دوران بینی نے مژدہ سنایا کہ جنت کا ''یونیورسٹی کالج'' میں داخلہ ہو گیا ہے اور فیس وغیرہ دی جا چکی ہے۔ جنت ایک دم کانفرنس سے اٹھی اور اپنے کمرے میں جا کر دو نفل شکرانہ کے ادا کئے۔ واپس آئی اور بینی کو گلے لگا کر بوسہ دیا۔ وفورِ جذبات سے خاموشی سے بینی بھابی کی طرف دیکھتی رہی اور جو کچھ اس کے دل میں تھا آنکھوں کی راہ بینی کے دل میں اُتار دیا۔ جمال نے نعرہ لگایا: ''کمال مبارک ہو، جنت مبارک ہو Let us celebrate''۔ بینی گئی اور وسکی کی بوتل اٹھا لائی۔ این وسکی پینے کی عادی تھی۔ وہ کہتی تھیں کہ ان کو گھٹی میں وسکی دی گئی تھی۔ وسکی، این کے لئے، نیبو پانی سے بیش نہ تھی۔ جمال شراب کے عادی نہ تھے لیکن کبھی کبھار اپنی بیوی کا ساتھ دے دیا کرتے تھے۔ ہاں کمال! جب اپنی بھابی کا ساتھ دینے پر آتے تو معلوم ہوتا کہ انکی عمر تو اِسی دشت کی سیاحی میں گزری تھی۔ انکی ٹانگوں میں شاید خلا تھا۔ جو کچھ پیتے ان کی ٹانگوں میں جا گرتا۔ کبھی انہوں نے اتنی نہیں پی کہ نشہ سر تک پہنچ جائے۔ احتیاط لازم تھی۔ جوان بیوی کو ناراض کرنا نہ چاہتے تھے۔ کمال کی یہ عادت جنت کو بہت ناگوار گزرتی تھی۔ مخمور شوہر سے دور بھاگتی اور ہاتھ نہ لگانے دیتی۔

کرسمس میں ابھی مہینہ باقی تھا۔ ''کانفرنس'' ہو رہی تھی کہ جمال نے ایک مژدہ سُنایا۔ کمال، لندن کی ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ کی نوکری کی کوشش کر رہے تھے۔ اس فرم نے جمال کی ضمانت قبول کر کے کمال کو نوکری پر بلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اکاؤنٹنٹ کا کام تھا جو کمال اچھی طرح جانتے تھے۔ کسی قسم کی دقت سامنے آتی نظر نہ آتی تھی۔ تنخواہ زیادہ نہ تھی مگر اس کے ساتھ میڈیکل کی تمام سہولتیں ان کو دی گئی تھیں۔ دونوں بھائی بہت خوش تھے۔ اس خبر نے کمال اور جنت کی زندگی میں مزید ٹھہراؤ پیدا کر دیا تھا۔ ہنی مون ختم ہو چکا تھا۔ جمال کو یا کمال کو پیسے کی کوئی کمی نہ تھی مگر پھر بھی کمال کی نوکری سے جنت کے کالج کے داخلے سے اور پُرانی سیکلی کے

ملنے سے ایسا لگتا تھا جیسے شطرنج کی بساط پر مہرے سج چکے تھے اور آہستہ آہستہ حرکت میں آنے شروع ہو گئے تھے۔ ابھی تک ہر چال خوش آئند تھی۔ کرسمس سے پہلے کمال نے اپنی نوکری پر حاضری دے دی تھی۔ لندن کے کرسمس میں کمال کو رش میں کام کرنے کا نیا تجربہ حاصل ہونے لگا تھا۔ کمال خوش تھے۔ جنت ان سے زیادہ خوش تھی۔

کرسمس آئی اور چلی بھی گئی۔ پُرانے کیلنڈر کو سب نے اُتار پھینکا۔ نیا سال آ گیا۔ جنت کی پڑھائی شروع ہو گئی۔ اس کی تمام ذاتی کتابیں دہلی میں رہ گئی تھیں۔ اب اس کی شوپنگ میں سب سے اہم فہرست کتابوں کی ہوتی تھی۔ گھر میں یمنٰی کی چھوٹی سی لائبریری میں جو کتابیں تھیں وہ بہت مددگار ثابت ہو رہی تھیں۔ گھر سے کتابوں کے جھرمٹ سے نکل کر کالج کی لائبریری اور وہاں سے نکل کر کلاسوں میں جانا اب جنت کا معمول بن گیا تھا جس میں جنت بہت خوش تھی۔ جنت کی کوشش ہوتی تھی کہ روزانہ کی "کانفرنس" کا ناغہ نہ ہونے پائے۔ تمام شکوے، تمام معروضے اسی کانفرنس میں پیش کئے جاتے تھے۔ ایک روز جمال کو یاد آیا کہ انکے بھائی کمال کو انکے فیملی ڈاکٹر نے بلایا تھا اور طبی معائینے کی تاکید کی تھی۔ پچھلی بار جب کمال لندن آئے تھے تو ان کا علاج ہوا تھا۔ اس وقت انکے لندن آنے کی وجہ انکے جگر کا علاج تھا۔ ڈاکٹر کو جب پتہ چلا کہ کمال لندن آئے ہوئے ہیں تو اس نے تاکید سے بلاوہ بھیجا کہ جگر کی موجودہ حالت کا معائنہ ضروری تھا۔ جمال نے اپنے بھائی سے کہا کہ وہ اپنے دفتری حالات کو دیکھ کر بتائیں گے کہ وہ معائینے کے لئے کب جا سکتے تھے۔ کمال بالکل مُکر گئے اور کہنے لگے کہ وہ پہلے سے زیادہ صحت مند تھے اور کسی معائینے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن جنت نے پول کھولی اور بتایا کہ وہ کبھی کبھی پیٹ میں سخت درد بتا کر لیٹ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کا معائینہ ہی بہتر ہو گا۔ معائینہ ہوا اور کمال کے جگر کی حالت پہلے سے زیادہ خراب بتائی گئی اور تاکید کی گئی کہ کسی قسم کی شراب ان کے لئے زہر قاتل ثابت ہو سکتی تھی۔ دوائیاں دے دی گئیں۔ جنت کی ایک ذمہ داری اور بڑھ گئی۔ یمنٰی نے شراب کی تمام بوتلوں پر تالا لگا دیا۔ دوسرے دن "کانفرنس" سب

کو بتایا گیا کہ شراب کی بوتلوں پر تالا لگایا جا چکا تھا۔ جنت بول پڑیں "جمال بھائی، ہوٹی والوں کا کہنا ہے کہ چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ میں اپنے شوہر نامدار سے درخواست کروں گی کہ وہ لندن کی کسی بھی پب میں قدم نہ رکھیں"۔

کمال: "اگر یہ حکم جاناں ہے تو ہم اس کو پورا کریں گے۔ جنت آج کی ڈاک دیکھی؟ یہ آپ کا خط آیا ہے۔" خط مارلین کا تھا۔ اپنے خاندان کے تازہ ترین حالات پر تبصرہ کیا تھا اور اس کے ساتھ ماہ نور کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر دیا تھا۔ اسی خط میں ماہ نور کے بھائی رضوان کی بھی تفصیلات تھیں۔ جنت نے یہ خط سب کو پڑھ کر سنایا تا کہ سب لوگ مطلع رہیں۔ ماہ نور لاہور میں گورنمنٹ کالج میں پڑھ رہی تھی اور اس کا ارادہ اپنے بھائی کی طرح، مائکروبیالوجسٹ بننے کا تھا۔ رضوان عجلت میں پہلے لندن آئے لیکن بعد میں انہیں کیمبرج کے چرچل کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ وہاں پر وہ اپنے مرغوب سبجیکٹ مائکروبیالوجی کی ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرنے میں اتنے مشغول تھے کہ اپنے والدین اور چھوٹی لاڈلی بہن ماہ نور کو بھی خط نہیں لکھتے تھے۔ لندن بھی آنا جانا نہ ہوتا تھا۔ اور اس غفلت پر ماہ نور بہت اُداس رہتی تھی۔ ماہ نور کی مسلمان سہیلیاں کراچی پہنچ چکی تھیں اور تقریباً سب نے اپنے اپنے گھر بسا لئے تھے۔ ہاں ایک بڑی خوبصورت لڑکی ذکیہ احمد ابھی تک لاپتہ تھی۔ پاکستان جاتے وقت انکی ٹرین پر حملہ ہوا تھا، پھر پتہ نہ چلا کہ اس کے ساتھ اور اس کے خاندان کے ساتھ کیا ہوا۔

۱۹۵۱ء

جنت کو لندن میں رہتے ہوئے تین سال ہونے کو آئے تھے اور چرخ شعبدہ باز نے اپنے پٹارے میں سے کوئی بھان متی کا کرتب نہیں دکھایا تھا۔ ہر مرحلہ آسان لگتا تھا اور حالات کی پیچیدگیاں ختم ہو چکی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس خاندان میں سوائے شادمانی کے گیتوں کے کبھی مرثیہ نہ پڑھا گیا تھا۔ جنت نے اپنے کالج میں نام پیدا کر لیا تھا۔ عینی اپنی پروفیسری میں مشغول تھیں۔ جمال اپنے بینک میں ایک درجہ اور اوپر جا کر وائس پریذیڈنٹ بن چکے تھے۔ کمال روزانہ اپنی فرم میں جا کر حساب کتاب کر لیتے اور اسی طرح کیلنڈر کے ورقے بدلتے ختم ہو کر کیلنڈر پر کیلنڈر بدلے جانے لگے۔ وقت نے خاندان کی جڑوں کو کاٹ دیا تھا۔ لوگ اتنا سوچ کر خاموش ہو جاتے کہ ٹھیک ہی ہوں گے یا مر گئے ہوں گے۔ ''مرنا سب کو ہے'' کہہ کر اپنے رشتے داروں کی شکل یاد کر کے گفتگو کے عنوان کو بدل دیا کرتے تھے۔

کرسمس ہر سال آتی رہی اور لمبی چھٹیاں بھی ہو جاتی رہیں۔ ۱۹۵۱ء میں بھی کرسمس آئی۔ چھٹیاں شروع ہونے والی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ جنت دروازہ کھولنے گئی۔ مسافر کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ ماضی کا بھولا بھٹکا لگا ذحقیقت بنا نظر آیا۔

Visitor: "Is that you Jannat?"

جنت وہم اور حقیقت کی کشمکش میں خاموش تھی کہ مسافر نے چونکایا ''جنت''۔

جنت: ''رضوان بھائی سلام علیکم۔

''ارے واہ پہچانی نہیں جارہی ہو۔ کمال ہے تم تو میم بنی ہوئی ہو۔ یہ بال سنہری کیسے ہوگئے۔ دوپٹہ کہاں پھینکا؟ مجھے بڑی خوشی ہورہی ہے تمہیں اس حلیہ میں دیکھ کر''

''آیئے اندر آیئے'' کہتی ہوئی وہ رضوان کو اندر لے آئی۔ جمال اور کمال اپنے اپنے دفتر سے ابھی تک نہ آئے تھے۔ یمنیٰ لیکچر دینے گئی ہوئی تھیں۔

رضوان: ''یہ کمال صاحب کا مکان ہے نا؟''

جنت: ''جی ہاں اور ہم یہاں پر ابھی تک مہمان ہیں۔ B.A. کرلوں تو اپنا گھر لے کر بیٹھوں گی۔ میرا پتہ کیسے چلا؟''

رضوان: ''ماہ نور سے۔ اس کا خط آیا تھا۔ اس نے کافی باتیں لکھی تھیں اور اس کو مارلین نے تمہاری ملاقات کی اور اس مکان کی تمام تفصیلات لکھ کر بھیجی تھیں''

جنت: ''آپ کی بیگم کہاں ہیں؟''

رضوان: ''ابھی تک پیدا نہیں ہوئی۔ تم ہسپتالوں میں ڈھونڈو، شاید تم کسی نوزائیدہ کو میرے لئے پسند کرلو۔''

جنت: ''عمر میں اتنا فرق؟ آپ سمجھتے ہیں کہ اگر جیون ساتھی تیس سال پرانا لذت آشنا ہو تو لطف سوا ملے گا؟ مگر ایسا ہوتا نہیں۔ اپنی عمر کی ڈھونڈیئے، رضوان بھائی۔ معاف کیجئے گا۔ میں نے کیا بکواس شروع کردی۔ لیکن قلندر ہرچہ گوید، دیدہ گوید۔ ارے یہ بتایئے کہ ماہ نور کیسی ہے؟''

اور باتیں شروع ہوگئیں۔ بچپنا ابھرنے لگا۔ ترکمان دروازہ یاد آیا۔ مومن علی کے گھر کا فرش دھوتا یاد آیا۔ دادی اماں کا رول یاد آیا اور باتیں ہوتی رہیں۔ دوپٹے بغیر ایک دوشیزہ کو یاد کیا گیا

جو کہ خود کشی کے در پے تھی۔

جنت: ''رضوان بھائی! میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ پلیز اس کے بعد کیا ہوا اسکا ذکر نہ کیجئے۔ وہ میری یادداشت میں نہیں ہے۔ مٹ چکا ہے۔ یہاں پر کسی کو اس واقعہ کی تفصیلات معلوم نہیں۔ یہاں پر اس کا ذکر نہ چھیڑئے گا، پلیز۔ یہ بتایئے کہ آپ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟''

رضوان: ''بتاتا ہوں۔ یہ بتاؤ پہلے کہ میں آج رات یہاں رہ سکتا ہوں؟''

''رضوان بھائی یہ میرا گھر نہیں ہے، لیکن یہاں دو بیڈروم اب بھی خالی ہیں۔ امکان تو ہے۔ جمال بھائی کو آنے دیجئے۔''

رضوان نے اپنی پوری روداد سنائی۔ بٹوارے کے دوران ہی اس نے محسوس کر لیا تھا کہ پاکستان اور ہندوستان میں کئی سال تک اتنی افراتفری رہے گی کہ علم کی کوئی قدر نہ کرے گا۔ وہ پاکستان بہت عجلت میں چھوڑ کر پہلے لندن آ گئے تھے۔ چھوٹی موٹی نوکری کر کے کیمبرج کا رُخ کیا اور بڑی مشکلات کے بعد چرچل کالج میں داخلہ ملا اور مزید تعلیم کے امکانات کھلے۔

رضوان: ''بس اب یہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ واپس جا کر کیا کریں گے۔ اگر کسی پر دل آ گیا، تم جیسی کوئی مل گئی تو شادی کر لیں گے۔''

''خدا نہ کرے کہ آپ کو میری جیسی ملے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں کتنی تقدیر کی ماری ہوں۔ اللہ کرے آپ کی شادی کسی نیک بخت سے ہو۔''

جنت نے بھی اپنی کہانی بتائی۔ جو شفقت اور پیار ہینی نے اس کو دیا تھا اور جس طرح سے اس نے یونیورسٹی کالج میں داخلہ دلوایا تھا، اس کا پورا ذکر کیا۔ جمال کی شفقت اور سنجیدہ رہنمائی کا ذکر کیا۔

رضوان: ''لیکن جنت، لندن کے یونیورسٹی کالج میں داخلہ بہت مشکل ہے۔ میں نے کوشش کی تھی۔ کسی نے گھاس تک نہ ڈالی۔''

جنت: ''ہاں، یہ بات صحیح ہے مگر وہاں پر ڈاکٹر ہینی پاشا کو سب جانتے ہیں۔ انہوں نے بہت رہنمائی کی۔''

اتنی دیر میں جمال اور ینی دفتر سے اپنے گھر واپس آ گئے۔

Jamal: "Hello, Hello, whom do we have here today?"

جنت نے رضوان کا تعارف کروایا۔ ماہ نور کا نام کافی سنا جا چکا تھا۔ "یہ ماہ نور کے بھائی ہیں۔" کپڑے بدلنے کے بعد جمال اور اینی ڈرائینگ روم میں آ کر بیٹھے۔ اتنی دیر میں جنت چاء بنا کے لے آئی اور باتیں شروع ہوئیں۔

رضوان نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ چرچل کالج میں اپنی ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کرسمس کے بعد کیمبرج جانے کا پروگرام تھا۔

Jamal: "Why don't you stay here during Christmas break.. Enjoy your Christmas here in London."

Rizwan: " That shan't be possible, but I can stay for few days. there is so much to talk about old days."

Annie: "Yes why not. We have a bed room to spare for you."

باتیں شروع ہو گئیں اور چاء بھی چلتی گئی۔ ینی کو یہ تعجب ہوا تھا کہ یہ نوجوان جس کی عمر ۲۸ سال سے زیادہ نہ تھی چرچل کالج اور مائکرو بیالوجی میں ریسرچ کر رہا تھا۔ اس نے رضوان کی قابلیت اور کیریکٹر کو پرکھنے کی خاطر کافی متلاشی سوالات کئے اور آخر میں کہنے لگی کہ ہندوستان میں کیسے کیسے اعلیٰ دماغ تھے جو اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر اپنی روزی کی تلاش میں ملک در ملک مارے مارے پھر رہے ہیں۔ بہترین مثال جنت اور رضوان کی تھی کہ اتنی کم عمر میں .U.K جیسی جگہ میں وہ اپنا مقام پا چکے تھے اور .U.K ان کی خدمات سے فائدہ اُٹھائے گا۔ ینی کا پورا نام تھا، Annie Victoria Balsham Pasha وہ Lord Balsham کی اولاد میں سے تھیں اور کیمبرج میں Peterhouse کالج کو اپنا خاندانی کالج کہتی تھیں۔ اسی وجہ سے ان کا کیمبرج کافی آنا جانا رہتا تھا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اگلی وزٹ میں وہ رضوان سے ضرور ملے گی اور تعلیمی گفت وشنیدٗ سے دونوں مستفیض ہوں گے۔

آج شام کی کانفرنس میں رضوان شامل تھے۔ کام کی باتیں کم اور بڑائی باتیں زیادہ ہوئیں۔ مُرغیوں کا ذکر ہوا، کوارٹروں کے فرش کی صفائی کا ذکر ہوا اور مارلین کا ذکر ہوا۔ جنت بولی "دِلّی والے، دِلّی والے ہی ہوتے ہیں۔ خواہ وہ اینگلو انڈین ہی کیوں نہ ہوں۔"
اس نے مزے لے لے کر، مارلین کا شعر سُنایا جو دلی میں نہیں بلکہ لندن میں ارشاد فرمایا گیا:

پہلے گھی سے بھاجی بنتی تھی، اب بھاجی سے گھی بنتا ہے
پہلے عورت بچہ جنتی تھی، اب پوری بھارت جنتا ہے

سب نے زور سے قہقہہ لگایا۔ رضوان بولے "مارلین اچھی اُردو بول لیتی ہے۔ مغربی لباس میں، مغربی تہذیب میں، لندن جیسی جگہ میں ایک اینگلو انڈین کی زبان سے اُردو کا شعر واقعی بہت اچھا لگا ہوگا۔ کاش میں ہوتا تو مکرر ارشاد کہہ کہہ کر اس کو بہت تنگ کرتا۔

Annie: OK, OK. That's enough. Now I want to recite a sheer in Urdu.

Jannat: What? You and shair in Urdu!

Annie: Yes , Yes. SUNO, SUNO.

"Isaq nay hum ko nikamma kardya
Varna ham kam ka admi tha."

واہ، واہ،واہ سے اور تالیوں سے گھر گونج اُٹھا۔

Jannat: "Please Bhabi once more. Wonderful. It is a matter of pride that you understand our culture and poetry."

Annie: "Stop, here comes one more."

"Ham ko maloom Jannat ki Aqeeqat
Dil khush karo, khayal achha"

گھر پھر تالیوں سے گونج اُٹھا۔ واہ،واہ، جنت اُٹھی اور اپنی بھابی سے چمٹ گئی۔ غالب کا کلام! کبھی اتنا اچھا نہیں لگا تھا جتنا کہ آج۔ لندن میں ایک انگریز خاتون کے منہ سے لگا۔

"Bhabi Annie. Please , once again."

Annie: OK Jannat. Sit and listen.

"Ham ko maloom Jannat ki Aqeeqaat

Rizwan khush ho khayal achha!"

Rizwan: Bhabi, you know what you said? It is very meaningful statement. You are a poet also.

Annie: Yes. I do. I know relationship between Rizwan and Jannat.

"Ham ko MALOOM, Janant ka security guard-Rizwan"

Jamal: Annie, you have been drinking again.

Annie: "Oh , once in a while! If Rizwan visits, Jannat won't you be drinking? I am a poet, No I am a poetess. Whisky invigorates my thoughts. Ham ko maloom Jannat ki aqeeqat"

اتنا خوشگوار ماحول اُس گھر میں برسوں بعد نصیب ہوا تھا۔ سب خوش تھے۔ عینی نے وسکی پی رکھی تھی لیکن وہ نشے میں نہ تھی۔ وہ آنکھوں کے جذبات سمجھنے کی ماہر تھی۔ یہ اُس کا پیشہ تھا۔ اس نے شراب کا سہارا لے کر کیوپڈ کا رول سنبھالا اور تیر پر تیر چلائے گئی۔ تیر جن کو لگنے تھے، لگ چکے تھے۔ کہیں پر خلش زیادہ تھی۔ کہیں پر تیر دل کے پار تھا۔ یہ ماحول ایسا تھا کہ سب خوشی سے مدہوش تھے۔ سوائے کمال کے۔ وہ شعروشاعری کے بعد نمایاں طور پر سنجیدہ نظر آنے لگے تھے۔ عینی نے صرف اُن کو خوشی کے دھارے میں بہتے نہیں دیکھا، وہ بولی:

Annie: "Kamal, Urdu poet Ghalib is one of the greatest poets in the world. I wish, I could understand his poetry. Do you understand his poetry? "

Kamal: "A little. But right now, I am not well. I am feeling sleepy. Excuse us, I must rest and sleep."

کمال نے صوفے پر سے اُٹھتے ہوئے کہا، ''چلو جنت سوتے ہیں۔'' یہ کہہ کر جنت کے اُٹھنے کا انتظار کرنے لگے۔

جنت: ''رضوان بھائی، شب بخیر۔ جمال بھائی، شب بخیر۔ بھابی، سویٹ بھابی گڈ نائٹ۔'' اور اُٹھ کر کمال کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

رات کافی گزر چکی تھی اور باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ جمال، اینی اور رضوان کے سامنے لندن، کیمبرج اور دہلی کے کوارٹروں کے ایوان کھلے پڑے تھے۔ سب کہاں کہاں، طاقِ نسیاں سے ہستیاں اُتر کر نیچے آ گئیں۔ ان کا تجزیہ، انکا برتاؤ، ان کا بھولا پن یاد کر کے ان کو دوبارہ بھلانے کی کوشش کی گئی۔ رضوان اعلیٰ درجے کے نہ صرف مقرر بن چکے تھے بلکہ مدبری بھی نمایاں تھی۔ متکلم کی حیثیت سے سننے والوں کو باندھ لیا کرتے تھے۔ اینی، ان کو متواتر پرکھتی رہی۔ ایک سائنٹسٹ کی حیثیت سے، ایک ۲۸ سالہ نوجوان کی حیثیت سے اور ایک چرچل کالج کے طالبِ علم کی حیثیت سے۔ شب بخیر کہنے سے پہلے رضوان جمال اور اینی کے دل پر اپنی عزت اور قابلیت کا سکہ جما لیا تھا۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ دو بجنے کو آئے تھے۔ اینی نے رضوان کو ان کا بیڈروم دکھایا اور خود اپنے بیڈروم میں سونے چلی گئیں۔ دوسرے روز رضوان نے لنچ کے بعد رخصت ہونے کی اجازت مانگی۔ اینی نے اپنی کار نکالی، جنت کو ساتھ بٹھایا اور رضوان کو South Kensington کے ٹیوب اسٹیشن پر جا کر خدا حافظ کہا۔ واپسی میں دونوں رضوان کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

Annie: "Rizwan is a very smart young man. He is handsom?"

Jannat: "Yes."

Annie: "He is bold and extremely intelligent. We have been talking to him till late last night. He is confident of himself and he is well mannered. Isn't he?"

Jannat: "Yes , he is."

Annie: "Jannat, he is the one who saved your life?"

Jannat: " Who told you that? Did he boast around?"

Annie: "No. He is too shrewd to say anything like that."

Jannat: "Who told you then?"

Annie: "No body told me, but I know it"

Jannat: "How do you know it?"

Annie: "Janant, I would like to remind you that I am a Psychiatrist. He saved yor life? Didn't he?"

Janaat: "I do not know. I had head injury. I do not remember."

Annie: "But you remember that it was he who saved your life."

Jannat: "Bhabi Annie, Y...Y... Y... Yes. Please.

Annie: "You miserable creature. You love him!"

Jannat: "I do not know what love is! I know what half male and half female looks like. I know what 30 year elder to me looks like. What is love? I love my books."

Annie: " You stupid girl, you have not bloomed as yet. You have been corrupted by your past. I pity you."

اتنی دیر میں یمنی کا گھر آ گیا۔ کار پارک کر کے دونوں بھابی دیورانی گھر میں آ ئیں۔ جمال ان دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔

جمال: "جنت، کمال کو متلی ہوئی تھی۔ کافی خون نکلا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا ہے۔ بلا نہیں۔ اس کے ٹیلی فون کا انتظار کر رہا ہوں۔ اللہ خیر کرے۔ ہو سکتا ہے کہ ہسپتال جانا پڑے۔"

جنت بھاگی بھاگی اپنے کمرے میں اپنے میاں کے پاس گئی۔ کمال بستر پر کروٹیں بدل رہے تھے اور تکلیف میں تھے۔ پیٹ میں شدید درد کی شکایت کر رہے تھے۔ دوا جو وہ روزانہ کھاتے

میں کیا کچھ لے کر آئے گا کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ چھٹیوں کا پہلا دن تھا کہ رضوان آئے اور نہایت خوشگوار دن گزارا۔ اتنا خوشگوار کہ پہلے شاید نہ گزرا ہو۔ ان کے جانے کے بعد دوسرے دن سب لوگ ہسپتال کے چکر میں پڑ گئے اور باقی چھٹیوں میں ڈاکٹر، کمال کے خون کے پیاسے لگنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کی پیاس بجھنی مشکل تھی۔ بار بار خون لیا جاتا اور ٹیسٹ کیا جاتا رہا۔ چھٹیوں کا ہر دن، پھول خریدنے اور کمال کو پہنچانے میں گزرتا معلوم ہو رہا تھا۔ جنت نے اُمید ظاہر کی کہ اس کے میاں چند روز میں صحت یاب ہو کر گھر پہنچ جائیں گے اور کافی چھٹیاں خوشگواری کے ساتھ اور سب کے ساتھ کاٹ سکیں گے۔ جمال نے اپنی بیوی اینی کو یہ بات بھی بتائی کہ کمال اینی کی وسکی چرا چرا کر پیتے رہے تھے اور وہ ہسپتال میں معافی مانگ رہے تھے۔

Annie: Jannat, did you know that he has been drinking my whisky?

Jannat: "No."

Annie: "How do you mean, No. Did he not smell?"

Jannat: "I never smelt his breath."

Annie: "As a wife you did not smell his breath?"

Jannat: "No. I hate drunkards"

Annie: " Oh my God!"

پنج ن اس کے ل کا ل یہ ہا کہ م کے ال اور
را ل اور کے و ال کے ے جا
مر کی ر ل کا جا وے کر کر ار کر اج کی کر
اور کے ات غور کر اور واپس آ جا پ روز ال کو واپس
جانے کی اجازت ل ر ل کا و اور وا ان ال کو ی اور ال کو زا ر
ال کی کے بارے جو وہ راز ر کی کی۔

دن گزرتے گئے۔ سردیوں نے منہ موڑا۔ خنکی کا ڈنک نرم پڑا۔ موسم خوشگوار ہونا شروع ہوا۔ سوکھے درختوں نے کونپلیں نکالیں۔ بہار پورے جوش سے ابھر کر آئی۔ بعض درختوں نے ایک پتہ نہ نکلنے دیا اور پھولوں سے لد گئے۔ جمال کے گھر کے بیک یارڈ میں ایک میگنولیا کا درخت تھا۔ اس پر بہار کچھ زیادہ ہی گل افشاں ہوئی۔ اس کے پھولوں کی مہک نہ صرف جمال کے گھر کو بلکہ پورے محلے کے باسیوں کو بے قابو کر رہی تھی۔ روبن اب ایسا نغمہ سناتا کہ بلبلِ ہزار داستاں نے خاموش رہنے میں مصلحت سمجھی۔ اس تو بہ شکن موسمی کیفیت میں جنت یمنی کے پاس پہنچی اور فرمائش کی کہ وہ کیمبرج دیکھنا چاہتی تھی۔

Annie: "How sweet. What's the latest?"

Jannat: "I have an offer from Downing College. I want to meet staff in that college and see other colleges of Cambridge."

Annie: "Sure. I have few lectures coming up. Yes, why not. It is a good omen."

ایک ہی ہفتہ گزرا ہوگا کہ "کانفرنس" کے دوران عینی نے بتایا کہ وہ اپنے لیکچروں کے سلسلے میں دو دن اور ایک رات کے لئے کیمبرج جا رہی ہے۔ امکان تھا کہ جنت کو ڈاؤننگ کالج میں نوکری مل جائے۔ اس واسطے جنت بھی اس کے ساتھ ہوگی۔ دوسرے دن شام تک واپس اپنے گھر واپس پہنچ جائیں گے۔ عینی نے کمال سے پوچھا کہ اسکو کوئی اعتراض تو نہ تھا۔ اور کمال نے جواب میں کہا:

Kamal: No why? It is good if she gets a job. I am working no more. But Bhabi, you look after her. She has never been to Cambridge.

منگل والے روز صبح سات بجے عینی نے اپنی کار نکالی اور جنت کو ساتھ بٹھا کر کیمبرج کی طرف روانہ ہوگئی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ لندن میں دھوپ اللہ کا بڑا تحفہ قرار دیا جاتا ہے۔ فضا مہک رہی تھی۔ جنت بہت سی امیدیں لئے جا رہی تھی۔ بہت قرینہ سے مغربی لباس پہن رکھا تھا۔ جنت کا رنگ پہلے ہی سرخ و سفید تھا۔ لندن کے موسم نے اسکو مزید نکھار دیا تھا۔ فضا نے جو شگفتگی بخشی اس سے جنت کا چہرہ چندے آفتاب چندے مہتاب بنا ہوا تھا۔ اسکو ایک اہم انٹرویو میں پاس ہونا تھا۔ دل ہی دل میں بہت خوش تھی اور اپنی خوشی اس سے چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ کبھی گنگناتی کبھی مسکراتی اور کبھی عینی سے پوچھتی:

Jannat: "Bhabi, do you think I will make it?"

Annie: "Why not? with your competence, beauty and courage, you will be an asset to any college or anybody....... What are your plans after you finish with you interviews?"

Jannat: " I do not know"

Annie: "Won't you meet Rizwan?"

Jannat: " I want to see him, but he is in Churchil College. I do not know where this college is situated."

Annie: "I know it. It is on the other side of Cambridge, near American

War Cemetry. I can't take you there. I am not your chaufer. Do you want to see him or meet him?"

Jannat: " I want to meet him, and talk, talk and talk."

Annie: "Did you arrange this interview because Rizwan was here?"

Jannat: " Bhabi Jan, please. No."

Annie: "I know a little bit of black majic. It may be possible to arrange your meeting."

Jannat: "How is it possible?"

Annie: "I can make it possible if you beg for it."

Jannat: "Bhabi Jaan, you are a mysterious woman. I want to see him PLEASE. Can you take me to Churchill."

Annie: "No. I will be very busy with my lectures. I can't take you to Churchill. But if you beg me sincerely, I can produce him at Downing."

Jannat: "Bhabi Jaan, I beg you. I want to see Rizwan, PLEASE. OK , I beg you."

Annie: "Request granted. I had already called him on telephone. He will meet you at Downing. You will have about 40 hours together including one night. I will disappear and pick you up next day at 4 pm at Downing. Enjoy your stay and give him his due. Don't be shy."

جنت کو ہچکی چڑھ گئی۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ منہ سے الفاظ تھرتھرانے لگے۔

"Bhabi Jaan. You will be with me? "

"No. I have my job .... tomorrow .... at 4pm ... Downing College gate."

عینی نے کیمبرج ریلوے سٹیشن کی طرف سے کیمبرج میں پہنچنا چاہا۔ اس راستے پر پہلا

کالج ڈاوننگ کالج ہے۔ جیسے ہی یہ لوگ کالج کے گیٹ پر پہنچے تو عینی نے کار روک لی۔ گیٹ کے سامنے رضوان کھڑے تھے۔ جنت نے اپنا ہیٹ ٹھیک کیا، عینک لگائی اور آہستہ سے کار سے نکل کر کھڑی ہوگئی۔ رضوان اپنی جگہ کھڑے رہے۔ انہیں شک تھا کہ یہ کون ہے؟ کہیں جنت تو نہیں؟ جنت کی نسوانیت نے قدم نہ بڑھانے دیا۔ وہ سوچتی رہی کہ رضوان آگے بڑھیں تو میں آگے بڑھوں۔ یہ کشمکش دیکھ کر عینی نے اپنی کار کا ہورن بجایا "بیپ"۔ یہ سگنل کافی تھا، دونوں بے تاب ہو کر ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ جوں جوں فاصلہ کم ہو رہا تھا قدم تیز تیز ہو رہے تھے اور آخر کار دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے ساتھ ملے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ رضوان بوسہ دینے کے لئے نیچے جھکے لیکن جنت کا ہیٹ آڑے آیا۔ جنت نے اپنا ہاتھ رضوان کے لبوں کی طرف کیا۔ رضوان کے لب جنت کے ہاتھ پر مَس ہوئے اور دونوں کھو گئے۔ منہ سے کوئی لفظ نہ نکل پایا تھا۔ عینی نے پھر ہورن بجایا اور جنت کا بیگ زمین پر رکھ کر زور سے چلائی:

Jannat, your bag. Tomorrow 4pm at same place. Good luck.

اور کار تیزی سے غائب ہوگئی۔ کار کے جانے کے بعد دونوں ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔ یہ بھول گئے کہ انکے ہاتھ ایک دوسرے نے پکڑ رکھے تھے۔ نگاہیں ایک دوسرے پر جمی ہوئی تھیں۔ بہت سنجیدگی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے دیکھتے کچھ تبسم پیدا ہوا اور رضوان کے منہ سے نکلا "جنت" ایسا لگا جیسے بے ہوشی کے عالم میں کسی کو ہوش آیا۔

جنت: "اسلام علیکم، رضوان بھائی۔ معاف کیجئے سلام کرنا بھول گئی تھی۔ کیسے آنا ہوا؟"

رضوان: "مجھے کیسے آنا ہوا یا تمہیں کیسے آنا ہوا؟... میں تو رہتا ہی یہاں پر ہوں۔ تم کیسے ٹپک پڑیں۔ کس کے کچے دھاگے سے بندھی چلی آئیں۔"

جنت: "اللہ کچے دھاگے کو برقرار رکھے"۔

رضوان نے جنت کی طرف دیکھا۔ نہ صرف دیکھا بلکہ حیرت کے ساتھ معائنہ کیا۔

اونچی ایڑھیوں نے اور شفاف اور سڈول پنڈلیوں کو پُر اعتماد طریقے سے قد کو سنبھالا دے رکھا تھا۔ کالے اسکرٹ پر سرخ بلاؤز، گلے میں ریشمی خوش رنگ سکارف۔ لہراتے ہوئے سنہری بالوں پر آگے کو جھکا ہوا ہیٹ۔ گوروں سے زیادہ گوری، زیتونی رنگت کو دیکھ کر رضوان بولے کہ "نہ! تم وہ جنت نہیں ہو سکتیں۔"

"رضوان بھائی، باتیں بعد میں۔ میرا انٹرویو ہے، یہاں ڈاؤننگ کالج میں۔ میرے سنگھار کو باسی نہ ہونے دیں۔ ذرا انٹرویو دے لوں پھر کھل کر باتیں ہوں گی۔ ابھی آدھ گھنٹہ باقی ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ کالج کے اندر تو چلیں۔"

"میں قدم تب آگے بڑھاؤں گا جب تم مجھے رضوان بھائی کہنا بند کرو گی۔ تم انگلینڈ میں ہو جنت، یہاں تو باپ کو بھی اس کے نام سے پکارتے ہیں۔ مجھے یہاں سب "Riz" کہتے ہیں۔ تم بھی مجھے Riz پکارا کرو"

Jannat: "Hi Riz, let's go in."

جب انٹرویو ختم ہوا تو جنت اور رضوان کے پاس وصل کے ۴۸ گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔

انٹرویو کے بعد دونوں کالج سے باہر نکلے۔ دونوں کو بھوک لگی ہوئی تھی۔ "دیکھو سامنے Court of Arms ہے" رضوان نے کہا "یہ اصل میں بہت پُرانی سرائے ہے۔ ہوٹل سمجھ لو۔ وہاں چل کر باتیں ہوں گی۔" دونوں دھڑکتے دلوں کے ساتھ ہوٹل کے ڈرائینگ روم میں پہنچے۔ لنچ کا وقت ہو چکا تھا۔ لوگ آہستہ آہستہ کھانے کے واسطے جمع ہو رہے تھے۔ ہوٹل کی فضا بڑی پُر سکون تھی۔ اور یہی کیمبرج کا خاصہ تھا۔ جنت مسکرائی اور ہیٹ اُتارتے ہوئے کہا "رضوان بھائی، اگر یہ ہوٹل ہے تو اس میں رات کو میرے ٹھہرنے کے لئے کمرہ مل جائے گا؟ صرف میرے لئے۔" "ہاں ہاں مل جانا چاہیے، پہلے میں کمرہ کا پوچھ کر آتا ہوں۔ تم یہاں مجیل "ملو" میں ابھی آیا۔"

جنت کو "ملو" کا لفظ سن کر کچھ یاد آیا۔ مسکرائی اور آہستہ آہستہ اپنا ہیٹ اتار کر میز

پر رکھا، ادھر اُدھر دیکھا۔ یہ ایک بڑا ہال تھا۔ بیچ میں پتھروں کا بنا ہوا آتش دان تھا۔ اس کی انگیٹھی اتنی بڑی تھی کہ شہتیر اس میں جلائے جا سکتے تھے۔ چھت کافی اونچی اور مختلف قسم کے پرانے پرچم اس پر آویزاں تھے۔ دیواروں پر جگہ جگہ مختلف Arm (جس کو اُردو میں شاہی نشان کہتے ہیں) سجے ہوئے تھے۔ نمایاں طور پر ہال کے درمیان میں "Arms of the Cambridge College" سجا ہوا تھا۔ اس کے بیچ میں سفید کراس تھا اور کراس کے چاروں طرف شیر بنے ہوئے تھے۔ جنت ان کو غور سے دیکھنے کے لئے اُٹھی۔ قریب سے جب دیکھا تو کراس کے بیچ میں جنت کی عزیز چیز بنی ہوئی تھی اور وہ ایک "کتاب" تھی۔ اتنی دیر میں ایک بڈھے انگریز نے ایک لڑکی کی دلچسپی کیمبرج کے کوٹ آف آرمز میں محسوس کی۔ بڈھا مخاطب ہوا:

"Is it your first visit to Court of Arms, Young lady?"

"Yes sir, this is my first visit to Cambridge."

"How interesting! There are 23 Arms in this hall. Have a look. All colleges are represented here. Have a look."

"Which is the oldest college in Cambridge?"

"Peterhouse. Come here I will show you their Arms."

بڈھا پیٹر ہاؤس کالج کے نشان کے پاس لے گیا۔

"How old is this college?"

"It was founded in AD 1284."

What! AD 1284?"

جنت حیران ہوئی کہ ۱۲۸۴ء تو بہت پرانا زمانہ ہے۔ دماغ پر زور دیا۔ تقریباً ۱۲۵۰ء علاؤالدین خلجی کا زمانہ بنتا ہے۔ اس کالج کی بلڈنگ سے علاؤالدین کے زمانے سے علم و ادب کا متواتر دھارا نکلنا شروع ہوا تھا اور آج بھی طالبعلم اس میں دو زانو ہو کر بیٹھتے تھے۔ بڈھے نے بتایا کہ اس کالج کے نشان پر صرف دو رنگ ہیں۔ لال اور پیلا۔ لال بیک گراؤنڈ پر کھڑی چار پیلی دھاریں ہیں اور چاروں طرف آٹھ شاہ ایڈورڈ اول کے تاج بنے ہوئے ہیں۔ جنت اس نشان کو

دیکھنے میں کھوئی تھی کہ پیچھے سے رضوان پہنچے:

Jannat: "Rizwan, what a wonderful place. I have fallen in love with cambridge. Excuse me, this is Mr. Rizwan Khan from Churchill College"

جنت نے رضوان کا تعارف بڈھے انگریز سے کروایا۔

"Phoo! Churchill College, the junior most college. Are you trying to become a scientist? Good for you. They have the latest machinery and equipment. Good day young lady."

جنت رضوان سے بے تابی کے ساتھ مخاطب ہوئی ''کمرے کا کیا ہوا؟''

''کمرہ مل گیا ہے''

''کمرہ مل گیا ہے نا۔ آپ تو جیل میں سوئیں گے نا''

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ نہیں سوؤں گا۔ خوش؟''

جنت نے بتایا کہ یہاں Buffet ہونے ہوتا ہے اور پہلے پیٹ پوجا کا بندوبست کرنا لازمی تھا۔ دونوں نے پلیٹیں اٹھائیں، کھانا پلیٹوں میں نکالا اور اپنی میز پر آبیٹھے۔ سامنے کھانا رکھا ہوا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف اطمینان سے بھرپور نگاہ ڈالی۔ آنکھوں کی راہ ایک دوسرے کے دل و دماغ میں داخل ہو کر سیر کرنے لگے۔ انکو پتہ تھا کہ وہ کیا سوچ رہی تھی اور اس کو پتہ تھا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ دونوں کے دل پر دستک ہوئی، جیسے کہا گیا ہو Yes, it has been a long time. ''آیئے کھانا شروع کیجئے''۔ کھانا شروع ہوا۔ ایک دو لقمے لئے ہوں گے کہ جنت بولی'' آپ کے چند الفاظ بہت چبھتے ہیں۔ اس ہال میں آ کر آپ نے کہا تھا کہ میز ''ملتو''۔ اس لفظ نے مجھے اٹھایا اور بچپن میں جا ڈالا۔

جنت: ''آج میں بہت خوش ہوں۔ پتہ نہیں کیوں خوش ہوں؟''

رضوان: ''میں بتاتا ہوں، کیوں خوش ہو؟ آج تم ولی میں ہو ...اور...میں بھی ولی میں ہوں۔''

''اچھا اب ایسا کرتے ہیں انگریزی نہیں بولتے۔ میری زبان تو انگریزی بول بول کر سوج گئی ہے۔ خاص کر بھابی جنی کے ساتھ بول بول کر۔''

رضوان: ''جنت! زبان کثرتِ استعمال سے بھی سوج جاتی ہے۔ شادی شدہ ہو۔''

''رضوان بھائی! پلیز... اچھا.. سُوجنے کا لفظ واپس۔ میری زبان تھک جاتی ہے۔ میری کمبخت کالی زبان تھک جاتی ہے۔ میری موئی اُجاڑ صورت زبان تھک جاتی ہے۔ اس کو ڈھائی گھڑی کی آجائے۔''

رضوان: ''بس بس۔ دادی اماں یاد آ گئیں۔ جنت، واقعی کیا زمانہ تھا۔ کیا تہذیب تھی۔ کتنی عجیب زبان تھی۔ کیسے کیسے طعنے دیے جاتے تھے۔''

''رضوان بھائی، بہت زخمی ہے دل میرا۔ پُرانی تلخ باتیں یاد نہ دلائیں۔ آج مجھے خوش رہنے دیں۔''

رضوان: ''دادی اماں کو میں نے یاد کیا تھا کہ تم نے؟ دیکھو جنت میں نے تم کو ہمیشہ ''تم'' کہا ہے۔ تم کیوں مجھے 'آپ' 'آپ' کرتی رہتی ہو۔ اور بار بار 'رضوان بھائی'۔ اری بھاگوان! میں تمہارا بھائی نہیں ہوں۔ کسی رشتے سے بھی بھائی نہیں ہوں اور نہ ہی میرا ارادہ بننے کا ہے۔ ساری دنیا مجھے 'رض' کہتی ہے۔ تم مجھے 'رض' کیوں نہیں کہتیں۔''

جنت: ''میں آپکو ساری عمر 'آپ' سے مخاطب کروں گی۔ کیونکہ میں آپ کی عزت کرتی ہوں۔ آپ نے میری جان بچائی تھی۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔ ہاں! آپ کو مجھے 'تم' کہنا بہت پیارا لگتا ہے۔ بچپنے سے آپ مجھے 'تم' کہہ رہے ہیں۔ بجا کہیے، بچ کہیے کہ ہاں 'تم' ہو۔ ہاں! 'رض' کا لفظ زبان پر چڑھا رہی ہوں۔ زبان سُوج کر موٹی ہوگئی ہے نا، چڑھ نہیں رہا۔''

رضوان: ''ارے چڑھانا آسان تھوڑی ہوتا ہے۔''

جنت: ''رض! پلیز.... اچھا یہ بتایئے کہ یہ 'ڈھائی گھڑی کی آجائے' کا مطلب کیا ہوتا تھا؟ آج تک سمجھ میں نہ آیا اور نہ ہی ڈھائی گھڑی کی بات سمجھ میں آئی''۔

رضوان: ''اس کا مطلب یہ تھا کہ ایسی موت آئے کہ ڈھائی گھنٹے تڑپنے کے بعد وہ اس دُنیا کو چھوڑ چکا ہو۔''

جنت: ''اگر مرنے کا کوسنا دینا تھا تو فوراً مر جانے کی دعا مانگی جاتی۔ یہ ڈھائی گھنٹے کی مہلت کیوں دی گئی؟''

رضوان: ''لو! اسی میں تو مزہ تھا۔ ڈھائی گھنٹے تک دشمن کو تڑپتا دیکھنا اور دیکھ کر خوش ہونا بھی تو لازم تھا۔ اب ڈھائی گھنٹے سے زیادہ کون مرنے کا انتظار کرتا۔ اس شغل کے لئے ڈھائی گھنٹے کافی تھے۔ پھر یہ بھی ڈر ہوتا کہ کہیں پولیس نہ آ دھمکے۔ پُرانے لوگ بڑے ہوشمند ہوتے تھے۔ کوسنے کا ریٹ ڈھائی گھنٹے پر منعکس رہا۔''

جنت: ''پتہ نہیں آجکل کیا ریٹ جا رہا ہوگا۔ کہیں کم نہ ہو گیا ہو؟''

رضوان: ''سوچنے کی بات یہ تھی کہ کوسنے والا یا متکلم کسی کو تکلیف دے کر یا تکلیف کی بددعا دے کر خوش ہوتا تھا۔ لعنت ہے ایسی Sadist سوسائٹی پر۔ تم کو خوش ہونا چاہئے کہ نجات ملی ایسی سوسائٹی سے۔''

آہستہ آہستہ کھانا کھاتے کھاتے کافی وقت گزر چکا تھا۔ باتیں خاص دِلّی کی زبان میں ہو رہی تھیں اور زبان کا متن سمجھنا انگریزوں کے لئے ناممکن تھا۔ وہ ان دونوں کو کسی کالج کے طالبعلم سمجھ رہے تھے۔ ان کو شان وگمان بھی نہ تھا کہ صاحب موصوف اور صاحبہ موصوف ترکمان دروازے کی کرخنداری پروڈکشن تھے۔

رضوان نے جنت کو کرسی سے اُٹھنے میں مدد کی، کرسی کو میز پر ٹھیک طریقے سے لگایا، جنت کا بیگ اُٹھایا، دروازہ کھولا اور کمرے کی طرف روانہ ہوئے۔ جنت بولی ''اب دیکھنا ہے کہ کمرے کا سین پاٹ کیا ہے۔ کیا میں اس میں رہ سکوں گی؟'' اوپر کی منزل میں رضوان نے کمرہ کھولا اور کمرہ اندر سے دکھایا۔ کمرہ کشادہ تھا، ایک سنگل بیڈ تھا اور تمام ضروریات کے ساتھ غسل خانہ برابر میں موجود تھا۔

رضوان: ''یہ کمرہ ہے۔''

جنت: ''آپ چرچل میں سوئیں گے؟''

رضوان: ''نہیں، میں بھی یہیں سوؤں گا''۔ جنت نے دروازے کی طرف دیکھا اور باہر جانے کی کوشش کی۔

رضوان: ''ایک اور کمرہ بھی ہے، آؤ''۔ رضوان برابر والے کمرے میں جنت کو لے کر گئے اور تالا کھولا۔ یہ کمرہ کشادہ تھا، ڈبل بیڈ لگا ہوا تھا۔ ساز وسامان نفیس تھا۔ ایک کونے میں کچنٹ تھا جہاں کافی، چاء وغیرہ بنائی جا سکتی تھی۔ ایک کھڑکی تھی جو باہر کی طرف کھولی جا سکتی تھی۔

رضوان: ''محترمہ جنت کمال پاشا کون سا کمرہ پسند کریں گی؟''

جنت: ''محترمہ جنت کمال پاشا، ڈبل بیڈ کی عادی ہیں، وہ یہ کمرہ پسند کریں گی۔''

رضوان نے جنت کا بیگ میز پر رکھا۔ جنت نے اپنا ہیٹ الماری میں رکھا۔

جنت: ''آپ کو معلوم ہے میں نے یہ کمرہ کیوں چنا ہے؟''

رضوان: ''بہت سی باتیں سمجھی جاتی ہیں، بتائی نہیں جاتیں۔''

جنت: ''جی نہیں، اپنے دماغ پر فضول زور نہ دیں۔ اس کمرے میں رات کو کافی بنا بنا کر پئیں گے۔ آپ بھی تو کافی کے رسیا ہیں نا۔ اچھا تھوڑی دیر کو تکلیہ میں انگریزی میم سے دیسی بن جاؤں، پلیز۔'' یہ کہہ کر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

رضوان اپنے کمرے میں گئے، جیکٹ اُتاری، اپنے بیگ سے ٹی شرٹ نکالی، منہ ہاتھ دھویا اور واپس آ کر جنت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب آیا ''آئیے، دروازہ کھلا ہے۔''
سامنے فیروزی کپڑوں میں ملبوس، دوپٹہ اوڑھے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ غور سے، خاموشی سے، آنے والے کو دیکھ رہی تھی۔ رضوان تیز تیز قدموں سے کمرے میں داخل ہوئے تھے لیکن جنت کو دیکھ کر جھجک گئے۔ یادوں کی یلغار سے بجلی کڑکی۔ جنت کو جب رضوان نے خودکشی سے بچایا تھا، اس وقت بھی وہ فیروزی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ آج جنت خاص طور پر اسی رنگ

کے کپڑے ساتھ لائی تھی اور رضوان کا ردِ عمل دیکھنے کے لئے بے چین تھی۔ رضوان سر پکڑ کے نیچے دیکھنے لگے '' Oh! my God ۔ مجھے خوشی ہے کہ ایک لڑکی، فیروزی کپڑوں، اپنی یادوں کی بھول بھلیوں کی مہرابوں میں، اپنا راستہ ڈھونڈ رہی ہے۔ شاید، ابھی تک، اس کو راستہ نہیں ملا۔''

جنت: ''پلیز رض، مجھے سنجیدہ موڈ میں نہ ڈالو۔ میرا مطلب ہے، رضوان صاحب مجھے سنجیدہ موڈ میں نہ ڈالئے۔ آج میں بہت خوش ہوں۔''

رضوان: ''آؤ، یہاں آؤ۔ کوئی نیا سین پاٹ نہ دکھاؤ۔ صوفے پر بے تکلفی سے بیٹھو۔'' جنت نے پیر سے جوتی نکالی، صوفے پر آلتی پالتی مار کر اپنا رُخ رضوان کی طرف کر لیا۔

جنت: ''آپ کو معلوم ہے کہ سین پاٹ کا لفظ میری زبان پر کیسے چڑھا۔ یہ کارخنداری زبان کا لفظ نہیں ہے۔ اسکول میں ہماری ایک سہیلی میمن خاندان سے تھی۔ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی واقعہ ہوتا رہا تا تھا۔ اس واقعہ کو وہ سین پاٹ کہتی تھی۔ اس نے یہ لفظ مارلین، ماہ نور اور میری زبان پر چڑھایا ہے۔''

رضوان: ''ہاں ماہ نور بھی یہ لفظ بہت استعمال کرتی ہے۔ اس کے ساتھ بھی کوئی نہ کوئی سین پاٹ ہوتا رہتا ہے۔''

جنت: ''سین پاٹ یہ ہے کہ چار بج گئے ہیں۔ ہمارے ہاں چار بجے چاء بڑے اہتمام کے ساتھ پی جاتی ہے۔ کیا خیال ہے؟''

رضوان: ''ایک منٹ ٹھہرو، میں نیچے سے کچھ چاء کے لئے لاتا ہوں۔''

رضوان نیچے سے چکن سینڈوچ اور مفن لے کر آئے، چاء کا پانی جنت نے تیار کر لیا تھا۔

جنت: ''ارے اتنے سینڈوچ کون کھائے گا۔ شام کا کھانا بھی تو کھانا ہے۔''

رضوان: ''تم بیٹھی رہو، چاء میں دم دیتا ہوں۔ صرف یہی کام تو ہم کو آتا ہے۔ لو کھاؤ، کھانا شروع کرو۔''

رضوان چاۓ بنا کر لاۓ۔ میز پر پیالیاں رکھیں، سینڈ وچ اور مفن سجا کر رکھے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گۓ۔ جنت نے آلتی پالتی کا پینترا بدلا۔ گھٹنے پر اپنی کوہنی ٹیکی اور ہاتھ کی مٹھی بنا کر اس پر اپنی ٹھوڑی رکھی اور ٹکٹکی باندھ کر رضوان کو دیکھنے لگی۔ رضوان نے پوچھا کہ جنت کس کا انتظار کر رہی تھی۔ چاۓ شروع کیوں نہیں کرتی۔

جنت: ''میں یہ سوچ رہی تھی کہ کتنی خوش نصیب ہو گی وہ جو آپ کے نکاح میں آۓ گی۔ آپ بڑے اچھے شوہر بنیں گے۔''

رضوان: ''ارے پچھتاۓ گی کمبخت، نامراد، جھاڑو پٹی۔ ہمیں چاۓ بنانے کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ ہم تو خدمت لیں گے۔''

جنت: ''کم بخت، جھاڑو پٹی کے ساتھ ڈھائی گھڑی کی کلا نا لازمی ہوتا ہے۔''

دونوں زور زور سے ہنسے۔ رضوان کی پیالی پلیٹ میں ہلی اور تھوڑی سی چاۓ صوفے پر گری۔

جنت: ''یہ تو وہ بات ہوگئی کہ آٹا گوندھتی ہے تو ہلتی کیوں ہے۔ ارے آپ پیالی لی کر ہنسیں گے تو چاۓ تو گرے گی۔ رض، آج دادی اماں کی ساری کہاوتیں یاد آ رہی ہیں۔ آج میں انگریزی بول کر ہی نہ دوں گی۔ آج میں دیسی ہوں۔ آج ہم کارخندار ہیں۔''

رضوان: ''تمہاری یادداشت، ماشاءاللہ بہت اچھی ہے۔ تمہیں دِلّی کی زبان خوب یاد ہے۔ میرے دماغ سے کافی الفاظ مٹ چکے ہیں۔''

جنت: ''میرے دماغ سے الفاظ نہ مٹنے کی وجہ یہ ہے کہ ان الفاظ نے مجھے نہ صرف دماغی اذیت دی ہے بلکہ جسمانی اور روحانی اذیت سے بھی مجھے تکلیف پہنچائی گئی ہے۔ یہ میرے دل پر داغ ہیں۔ اچھا کوئی خوشگوار بات کی جاۓ۔ پلیز، اچھا یہ بتایۓ کہ ماہ نور کا کیا حال ہے۔''

رضوان: ''ارے ٹھیک ہے۔ اس سال ماسٹرز کر لے گی پنجاب یونیورسٹی سے۔ نوکری نہیں کر رہی، خوش ہے۔ اماں ابا کی خدمت کر رہی ہے۔ جب بھی ٹیلیفون آتا ہے تو جنت کو اور مارلین کو ضرور پوچھا جاتا ہے۔ شادی نہیں کی اور شاید نہ ہی کرے۔ پاکستان میں اس کے معیار کا شوہر

ملنا مجھے تو مشکل لگتا ہے۔''

جنت: ''رض، انکل مومن کے گھر کا فرش دھونا یاد ہے؟''

رضوان: ''وہ ہنگامہ کیسے بھولا جا سکتا ہے۔ اُف! وہ ماہ نور کا اور تمہارا ناچنا 'دمادم مست قلندر' اور دادی اماں کے سر پر مرغی کا بیٹھنا۔ وہ سرکس، ہماری زندگی کا ریکارڈ توڑ ہنگامہ ہے۔''

جنت: ''اور وہ آپ کو پانی کو سائفن کرنا۔ وہ .....مرغیوں کا ڈربہ کھولنا؟''

رضوان: ''ہاں وہ بھی، اور واجد علی کا ٹوٹی میں ٹیوب لگانا۔ تمہیں معلوم ہے ہم لڑکے واجد علی کو کیا کہتے تھے؟''

جنت: ''کیا کہتے تھے؟''

رضوان: ''آپا جان۔''

جنت: ''رض، میں ہاتھ جوڑتی ہوں، اس قسم کی اور بات نہ کیجئے۔ کم از کم آج نہیں، پلیز''

باتیں ہوتی رہیں اور ہوتی رہیں۔ حاسد گھڑی نے تیز چلنا شروع کر دیا۔ ابھی باتوں کا موڈ بنا ہی تھا کہ بھوک نے پیٹ گڑگڑایا اور بتایا کہ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ دونوں رات کا کھانا کھانے کے لئے نیچے آئے۔ جنت نے شلوار قمیض نہ بدلی، اسی طرح غیر رسمی لباس میں رات کا کھانا کھا کر واپس کمرے میں آئے۔ رات کے دس بج چکے تھے۔

جنت: ''اب کافی بنانے کی باری میری ہے۔ کافی میں بنا رہی ہوں۔''

رضوان: ''دیکھو آٹا گوندھنا تو بلنا نہیں۔ کافی کی پیالی لیکر ہنسنا نہیں۔''

جنت: ''کہیں ایسا نہ ہو کہ میں آٹین چھوڑ کھسیٹن میں پڑ جاؤں''

رضوان: ''کیا بکواس ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کافی نشتر تمہارے دل پر لگائے گئے ہیں کہ ایک ایک ضرب المثل تمہیں یاد ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟''

جنت ''میرے خیال میں دادی اماں کا مطلب ہوتا تھا کہ کام اُلٹا ہو جائے۔ کوئی کسی کو کھینچ رہا ہو اور وہ خود کھنچنا شروع ہو جائے۔ مجھے کافی پیتے پیتے، برتن نہ دھونے پڑ جائیں۔ میں اس وقت

انجن چھوڑ گھسیٹن میں نہیں پڑنا چاہتی۔"

جنت کافی بنا کر لائی۔ دونوں میز پر بیٹھ کر باتیں کرتے گئے، اپنے ماضی کو یاد کرتے رہے۔ اگر چہ ان دونوں نے اپنے دقیانوسی ماحول کی کشتی سے چھلانگ لگا کر سمندر پار کر لیا تھا اور علم و ترقی کے گلستان میں سیر گشت کر رہے تھے، مگر کبھی کبھی ان کا خون اور ان کا خمیر انکو یاد دلاتا تھا کہ وہ کون تھے۔ آج کیمبرج کی فضا میں کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ ایک کیاری میں دو پھول نکلے۔ ایک کو کوئی توڑ کے لے گیا اور دوسرا ہاتھوں ہاتھ پھرتا رہا۔ آج تقدیر نے ایک کُنج میں ان دونوں کو پھر یکجا کر دیا تھا۔ دونوں کا سفر نامہ ان کے سامنے کھلا ہوا تھا۔ کوئی بات ایک دوسرے سے چھپی نہ تھی۔ یہ دونوں ہم نفس، ہمراز اور ہمدرد تھے۔ ہر بات پر ایک دوسرے کو لقمہ دے رہے تھے۔ ایک دوسرے کے منہ سے بات چھین لیتے تھے، تعلیم یافتہ تھے۔ عمریں پکی ہو چکی تھیں۔

دادی اماں کا ذکر ہوتا رہا۔ جنت نے پھر لقمہ دیا "اچھا! ہمارے خاندان میں کوئی کسی چیز کو اچھا نہیں کہہ سکتا تھا۔ رض! آپ ان کے سامنے سونا رکھ دیں اور پوچھیں کہ کیسا ہے تو اس کو کبھی 'اچھا' نہیں کہا جائے گا بلکہ 'بُرا نہیں ہے' کہیں گے کہ نفی کی صفت بھی استعمال ہو گی اور مطلب بھی پورا ہو جائے گا۔ کس قسم کے لوگ تھے یہ؟"

رضوان: "اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جہالت ہے۔ اچھائی اور بُرائی کے ہزاروں درجے ہیں۔ کوئی چیز کس درجے پر کب کہی جائے، اس کے لئے علم چاہیئے۔"

جنت: "میں نو سال کی تھی۔ رض، سُنئے، پلیز۔ دادی اماں نے میری ماں باپ سے پوچھے بغیر میری منگنی میرے خالہ زاد بھائی، جسے آپ لوگ آپا جان کہتے تھے، کے ساتھ کر دی۔ نہ صرف منگنی بلکہ سولہ سال کی نہ ہوئی تھی کہ شادی کر دی۔ اچھا سُنئے، رض پلیز، میں بہت کنفیوز ہوئی۔ مجھے صرف اتنا پتہ تھا کہ اچھے کپڑے ملیں گے۔ سچ کہتی ہوں مجھے اس سے زیادہ کچھ پتہ نہ تھا۔ میں دماغی طور پر اپنی کتابوں میں اتنی محو رہتی تھی کہ دماغی طور پر یا جسمانی طور پر ازدواج کو بھی نہ

تھی۔ شادی ہوئی تو وہ بھی اس ہجڑوے کے ساتھ لیکن وہ Blessing in disguise تھا۔ اگر کوئی تگڑا جوان ہوتا تو میں اس وقت بچے پال رہی ہوتی۔ رض، پلیز، معاف کیجئے گا۔ بک رہی ہوں جنون میں کیا کچھ!"

رضوان: "لیکن یہ بات تو ایسی نہ تھی کہ تم خودکشی کر لیتیں؟"

جنت: "رض، اس احمق نے اپنی کمزوری چھپانے کے لئے مجھ پر الزام لگایا تھا کہ میں سینٹ سٹیفن کے کسی لڑکے کے ساتھ پھنسی ہوئی تھی۔ یہ الزام میں کیسے برداشت کر لیتی۔ خاندان کی رسومات بد کو دیکھ کر طلاق ناممکن تھی۔ خودکشی ہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔ وہ اعلیٰ حضرت رضوان خاں نے روک لیا۔ سارا کھیل جھنڈ کر دیا۔ دعا دیتی ہوں رہزن کو۔"

رضوان: "تمہیں خودکشی یاد ہے، جنت؟"

جنت: "تھوڑی سی۔"

رضوان: "جھوٹ نہ بولو... کتنی یاد ہے؟"

جنت: "بہت گہرائی میں دور، ریل کی پٹڑی تھی۔ میں ریل کی پٹڑی کا نشانہ باندھ رہی تھی ....پھر کسی نے مجھے نیچے گرا دیا اور میرے سر پر چوٹ لگی اور میں بے ہوش ہو گئی تھی۔"

رضوان: "اچھا! تمہارے اس کارنامے کے بعد ہمیں کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ آخر ماجرہ کیا تھا۔ محلے والوں کو اتنا بتایا گیا تھا کہ جنت ناخوش ہے۔ وجوہات راز میں رکھے گئے۔"

جنت: "کیوں مجھے جگرِ لخت لخت کو جمع کرنے پر مجبور کر رہے ہیں آپ۔ رضوان بھائی۔ یہ قصہ تب کا ہے جب 'آتش جوان تھا اور رض رضوان تھا اور وہ آپا جان تھا۔"

جنت: "رض، واقعی بہت عجیب خاندان تھا۔ خودکشی کی خبر کو چھپانے کے لئے اور لڑکی کو ظلم کی طاقت سے راہ راست پر لانے کے لئے اس کو قید کر دیا گیا تھا۔ یہ قید نہ تھی، ایک فولادی خول تھا جو مظلوم لڑکی پر ڈالا گیا تھا۔ لیکن اس میں ایک سوراخ تھا۔ اس سوراخ میں سے، جنت کو رام کرنے کے لئے ایک گرو کو بھیجا گیا۔ وہ گرو جہاں دیدہ اور لڑکی سے تیس سال بڑا تھا۔ تجربہ

کار تھا۔ لڑکی اس کا سہارا لے کر اس چھوٹے سے سوراخ میں سے نکل کر فرار ہو گئی اور اسی گرو سے ازدواجیہ رشتہ قائم کر لیا۔ قصہ ختم۔"

رضوان: "اچھا جنت! مجھے آج یہ ساری باتیں معلوم ہوئیں ہیں۔ ہمیں تو تمہاری اذیت کا یا بہادری کا یا خوش قسمتی کا یا بد قسمتی کا احساس ہی نہ تھا۔ ہم سب لاعلم رکھے گئے تھے۔"

جنت: "ہمیں ایک بات کیمبرج کی بہت بُری لگی ہے۔ یہاں کی گھڑیاں بہت تیز چلتی ہیں۔ جناب، دوسرا دن ہو چکا ہے۔ رض، گھڑی جھوٹ بول کر صبح کے دو بجا رہی ہے۔ گھڑی جھوٹی ہے نا، رض۔ پلیز کہیے ہاں۔"

رضوان: "اتنی زبردست شخصیت، اتنی روشن دماغی کے ساتھ، ایک عظیم ہستی اپنی زندگی اس چھوٹی سی گھڑی کی ڈبیا پر انحصار کرنا چاہتی ہے۔ یہ چھوٹی سی مشین ہے جو چلتی ہے، چلنے دو۔ بڑی ہستیاں اتنی تناور ہوتی ہیں کہ گھڑی کے نمبر اس کی سوچ کو یا اس کی حرکات کو کنٹرول نہیں کر سکتے۔ جو کچھ آج میں نے تم سے سُنا ہے، اس سے تمہاری عزت میرے دل میں کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ تمہاری زندگی سے کشمکش اور منزل کا تقرر اور سعیِ پیہم بے مثال ہے۔"

جنت: شاعری بند...کافی ٹائم.....اس مرتبہ تم بناؤ۔ سوری رض، آپ بنائیے۔ چلو تم بنا لو۔"

رضوان اُٹھے اور بچے ہوئے مفن نکالے اور میز پر رکھ دیئے۔ دوپٹہ جو کچن میں پڑا تھا، اس سے مخاطب ہوئے "اے بے ادب، تو تو کسی کا محرم ہے۔ یہاں کیا کر رہا ہے؟" یہ کہہ کر دوپٹے کو پلنگ پر ڈال دیا اور پھر باتیں شروع ہو گئیں۔

رضوان: "کمال تمہیں کیسے لگے؟"

جنت: "کمال...کمال.....میرے لئے عظیم ہیں۔ میں ان کی احسان مند ہوں۔ یہ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے مجھے قید کی چھوٹی سی جھری سے نکالا۔ میری قوت پرواز کو تقویت دی۔ مجھے عیش دیئے۔ مجھے دولت دی، اور میری ہر خواہش کو پورا کیا۔ کہاں ترکمان دروازہ اور کہاں لندن۔ کہاں مومن علی کا کوارٹر اور کہاں یحییٰ کا گھر۔ میں ان کی عزت کرتی ہوں۔ قید سے نکالنے کی اور

اعلیٰ تعلیم انگلینڈ میں دلوانے کی۔ انہوں نے شرط یہی رکھی تھی کہ میں ان سے شادی کروں گی۔
اس قید سے نکلنے اور اس خاندان سے نجات پانے کے لئے یہ سودا بُرا نہیں تھا۔ فائدہ میں اُٹھا رہی ہوں۔"

رضوان: "تم نے انہیں پسند کیا تھا؟"

جنت: "وہ مجھ سے عمر میں ۳۰ سال بڑے ہیں۔ میں ان کی عزت کرتی تھی اور کرتی ہوں۔
انہوں نے اپنا وعدہ اچھی طرح نبھایا ہے۔ مجھے تعلیم دلوائی، مجھے کبھی کسی قسم کی شکایت کا موقعہ نہ دیا۔ جو کچھ بھی میں آج ہوں وہ ان کی وجہ سے ہوں۔"

رضوان: "Do you love him?"

جنت: "وہ کیا ہوتا ہے؟ میری عمر اب پکی ہوگئی ہے، میرا تجربہ یہ ہے کہ زندگی ایک مسلسل مشقت ہے۔ بیل کو کولہو کے چکر لگانے ہوتے ہیں۔ کسی کو تیل مل جاتا ہے، بیل تھک کر بیٹھ جاتا ہے۔ شاید میں محبت کے لئے ابھی تک جوان نہیں ہوئی۔ بڑھاپا جان نہیں چھوڑ رہی ہے۔
اب کچھ حالات میں استحکام پیدا ہوتا جارہا ہے۔ کمال کی بس ایک بات مجھے پسند نہیں۔ شراب انہیں مارے دے رہی ہے۔"

رضوان: "دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک لگتے ہیں!"

جنت: "کافی بیمار ہیں۔ آیئے دادی اماں کو یاد کرتے ہیں۔ پرائے برتے کھیلا جوا، آج نہ موا کل موا۔"

رضوان: "تم واقعی مشرقی زبانوں کا گہرا علم رکھتی ہو اور لحاف میں لپیٹ کر بہت کچھ کر کہہ جاتی ہو۔ جوتیاں بھی مار لیتی ہو۔ آج نہ موا کل موا۔"

جنت: "رضی، جوا کھیلا تھا، وہ بھی اپنے سے ۳۰ سال سینیئر کے ساتھ۔ اب ان کی طبیعت کی بہت فکر ہے۔ میری عمر ایک سال میں ایک سال ہی بڑھتی ہے مگر ان کی عمر ایک سال میں پانچ سال بڑھ رہی ہے۔ کافی کمزور ہوگئے ہیں۔ آیئے نالندن، ملیں سب لوگوں سے۔"

جنت نے اپنے شوہر کی موجودہ بیماری کی تفصیل کے رپورٹ دی۔ کمال کی چوری چوری شراب نوشی کی عادت پر پورا گھر ناراض تھا۔ اس کا پورا حال بتایا، اور یہ بھی بتایا کہ انکا جگر لندن آنے سے پہلے خراب ہو چکا تھا اور اس کا علاج چھپ چھپا کر ہوتا رہا تھا۔ کمال نے اپنی لندن کی نوکری چھوڑ دی تھی اور اب ان کا زیادہ وقت اخبار بینی میں صرف ہوتا تھا۔ جنت اور رضوان جب اپنی گزشتہ زندگی کا جائزہ لیتے تو ان کو ایسا لگ رہا تھا کہ دو مستقل مزاج ہستیاں زندگی کی سپید و سیاہ بساط پر پیادوں کی طرح ایک ایک قدم سیدھا چلتی رہیں۔ لیکن جب بھی عدو کی زد میں آتا تو ترچھا چل کر اسے کاٹ کر دور پھینک دیتیں۔ اپنی ثابت قدمی سے اب اس دہلیز پر پہنچ گئی تھیں کہ ان کو بادشاہ کے ساتھ اعلیٰ عہدہ ملنے کا امکان تھا۔

باتوں کا جب تاریخی، جغرافیائی اور سوشل خزانہ ختم ہونے کو آیا تو جنت نے پوچھا کہ رضوان کا مستقبل میں کیا ارادہ تھا۔ ڈاکٹریٹ کے بعد کیا پروگرام تھا۔ رضوان نے بتایا کہ اس کو تین اوفر آ چکی ہیں لیکن وہ Glaxo Lab. میں ریسرچ آفیسر بننا پسند کرے گا۔ پاکستان یا ہندوستان جانے کا کوئی امکان یا ارادہ نہ تھا۔

رضوان: ''جنت، سیدھی سادی بات ہے۔ میری تعلیم کی پاکستان میں یا ہندوستان میں کوئی قدر نہیں کرے گا۔ یہ کچھ ایسا ہوگا کہ ایک ہیرے کو آپ سبزی منڈی کی دکان پر رکھ دیں۔ وہاں ہم، جس میں میں آپ بھی شامل ہیں، برباد ہو جائیں گے۔ تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

جنت: ''میرا زندگی کا مقصد Oriental Languages پر تھیسس لکھنا رہا ہے۔ میں اس میں کامیاب ہو جاؤں گی، انشاءاللہ۔ میں لوگوں کو اپنا علم پہنچانا چاہتی ہوں۔ پروفیسر بنوں گی۔ اللہ میری مدد کرے۔''

رضوان: ''بہت اچھا خیال ہے۔ بہت اچھا ارادہ ہے۔ تمہارا گول مجھے تمہاری گرفت میں نظر آ رہا ہے۔''

جنت: ''کافی ٹائم! اس مرتبہ کافی میں بناؤں گی۔ رض! آپ کا کھایا ہوا آدھا سفن بچا ہوا

ہے۔ میں کھالوں؟ بھوک لگی ہے۔"

رضوان: "میرے منہ کے جراثیم کا زہر برداشت کرلوگی؟"

جنت: "زیادہ سے زیادہ مرہی جاؤں گی۔ کتنی خوش قسمت ہوں گی۔"

جنت مفن کھاتی گئی، کافی بناتی گئی، باتیں کرتی گئی۔ باتوں کوسلسلہ جوتر کمان دروازے سے شروع ہوا تھا، گرد وکارواں میں کنگھی کرتا ہوا، دل کے غبار نکالتا ہوا، ہوتی کی کارخنداری زبان بولتا ہوا، اب نئے موضوعات کا متلاشی تھا۔ ماضی کو چھوڑ کر مستقبل کو دیکھ کر اب باتیں حال پر آ گئی تھیں۔ دو جانے پہچانے دلوں کو تمام رات گزارنے پر، احساس ہوا کہ وہ کمرہ جس میں انہوں نے رات کاٹی تھی، وہ کیمبرج میں واقع تھا۔ جنت نے اس عظیم علم کے گہوارے کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔ اس نے Coat of Arms کے بڑھے کا ذکر کرتے ہوئے یاد دلایا کہ اس شہر میں ۳۲ کالج تھے اور سکون کی یہ حالت تھی کہ نہ ٹریفک کی آواز اور نہ ہی کسی قسم کے شور کی آواز! یہ کس قسم کا شہر ہے؟ رضوان نے کیمبرج کے بارے میں بتانا شروع کیا کہ کیمبرج، کیمبرج ہے۔ یہ نہ شہر ہے، نہ ہی گاؤں۔ یہ کیمبرج ہے۔ ایک مدرسہ جس میں ۳۲ کالج بستے ہیں اور ۷۰۰ سال سے پہلے سے بستے چلے آئے ہیں۔ یہاں کے تعلیم یافتہ شاگردوں میں دُنیا کی اور تاریخ کی نادر ہستیاں شامل ہیں۔ اس تعلیمی شہر کی سب سے نمایاں خصوصیت یہاں کی فضا ہے۔ یہاں فضا کو سونگھا جا سکتا ہے۔ معطر معطر نسیم، گل فشاں بہار اور روح افزا دوپہر...... "اور چہ چل کالج کی رومانک راتیں۔" جنت نے لقمہ دیا۔

رضوان: "جی نہیں چہ چل کی پڑھائی میں کسی کو یاد نہیں رہتا کہ رومانس کیا چیز ہے۔"

سامنے والی کھڑکی پر دستک ہوئی۔ صبا نے کواڑ کھٹکھٹائے۔ جنت اُٹھی اور کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ مہک کا ایک جھونکا آیا اور جنت کے گالوں کو خنکی محسوس ہوئی۔

جنت: "رضوان! صبح ہونے کو ہے۔ شفق پھوٹ رہی ہے۔"

رضوان: "جنت! آج تو حد ہوگئی۔ پانچ بج رہے ہیں۔"

جنت: ''آپ نے تو کہا تھا کہ گھڑی پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔''

رضوان بھی کھڑکی سامنے آ کھڑے ہوئے۔ ان کو بھی خنکی محسوس ہوئی۔

جنت: ''چل خسرو گھر اپنے، سانجھ بھئی چو ندیس''

اگر آپ اس کا پہلا مصرع بتا دیں تو میں عمر بھر کو آپ کی غلام بن جاؤں گی۔''

رضوان: ''سوچ لو، عمر بھر کا وعدہ ہے؟''

جنت: ''سوچ لیا۔''

رضوان: ''گوری سوئے سیج پر، مکھ پر ڈارے کیس

چل خسرو گھر اپنے، سانجھ بھئی چو ندیس

جنت، ہم بھی دِلّی والے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیا کے وصال پر امیر خسرو کا شعر ہے۔''

جنت: ''امیر خسرو کا تو میں نے سبجیکٹ کے طور پر مطالعہ کیا ہے۔ لیکن جس سائنٹسٹ کو امیر خسرو کا کلام یاد ہو، میں اس کی عمر بھی غلامی کرنے کو تیار ہوں۔ وعدہ کرتی ہوں۔ یہ کھڑکی گواہ رہے گی۔'' جنت نے وعدہ تو کر لیا تھا، اب وعدہ نبھانے کا تصور کر کے رضوان کی طرف آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے نئے ماسٹر کو دیکھتی رہی۔ محمود و ایاز تصور میں آئے۔ رضیہ سلطانہ اور یعقوت کا تصور کیا اور پھر جھنجلا کر ہوش میں آئی اور بولی ''رض، سانجھ بھئی، آؤ سیر کو چلتے ہیں۔ نیچے، سڑکوں پر سیر کرتے ہیں۔'' جنت نے شلوار قمیض پر جیکٹ پہنی اور رضوان نے بھی انہی کپڑوں پر جیکٹ پہنی اور دونوں نیچے اُتر گئے۔ ابھی سڑکوں پر اندھیرا تھا۔ نہ آدم اور نہ آدم زاد۔ دھند کا لحاف اوڑھے پورا شہر ابھی سو رہا تھا۔ دو منچلوں کو احساس ہوا کہ بھیگی بھیگی رات کس کو کہتے ہیں؟۔ شبنم ہر سانس کے ساتھ جسم میں جا کر روح کو نئی حیات بخش رہی تھی۔ سڑک پر بجلی کے کھمبوں کے بلب ابھی تک جل رہے تھے۔ کہر میں روشنی کے غلاف سے لٹکے معلوم ہوتے تھے۔ جیسے گزشتہ رات کے گناہ گاروں کے سفید کفن لٹک رہے ہوں۔ نسیم کا ہر جھونکا معطر معطر تھا۔ خنکی تھی۔ رضوان نے اپنی جیکٹ کو ٹھیک طرح سے اپنے سینے کو ڈھانکا، پھر دیکھا کہ جنت

کو بھی سردی لگ رہی تھی۔ "رض پلیز، میری جیکٹ ٹھیک کر دیجئے۔" رضوان نے جنت کو جیکٹ پہنائی۔ جنت شلوار قمیض میں اب بھی سردی محسوس کر رہی تھی۔ تھوڑی سی کپکپاہٹ کے ساتھ سہارا ڈھونڈا۔ رضوان کا ہاتھ دور نہ تھا۔ ابھی دن نکلنے میں دیر تھی۔ ابھی تو پرندے بھی سو رہے تھے۔ آج کیمبرج میں صرف یہ دو دیوانے تھے جو سڑکوں پر نکل پڑے تھے۔ سردی میں ان کو گرمائی چاہیئے تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ رات بھر کی جاگی جاگی سرخ آنکھوں سے، جنت دھند کو کبھی گھورتی اور کبھی سبز تختوں پر شبنم کو اپنے پانوں پر محسوس کرتی۔ کبھی اس کو اپنی بغل میں کسی کی گرمائی محسوس ہوتی۔ کبھی صبا اس کی زلف لہرا جاتی۔ کبھی روبن کا نغمہ سروش بن کر اس کے کانوں میں بس جاتا اور کبھی ناک پر نمی محسوس کرتی۔ اسکے سینے کے گنبد سے گونج اٹھی! جنت نے گنگنانا شروع کیا:

جنت: "نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم"

رضوان: "جنت تم تو بہت اچھا گالیتی ہو، ایک دفعہ پھر" شب جائے کہ من بودم

همہ شور سلاسل بود، شب جائے کہ من بودم

شب جائے کہ من بودم

فزوں تر درد دل بود، شب جائے کہ من بودم

شب جائے کہ من بودم

ہر سو رقص بسمل بود

جنت اور رضوان: "شب جائے کہ من بودم شب جائے کہ من بودم"

جنت اور رضوان با آواز بلند: "ہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم"

رضوان: "کیمبرج بھی کیا یاد کرے گا کہ کبھی اس سنسان سڑکوں پر، فجر کے وقت، سردی میں کانپتے ہوئے دو دیوانوں کی زبان سے امیر خسرو کے کلام کا ورد ہوا تھا۔"

ابھی سورج نکلنے میں دیر تھی۔ سردی میں دونوں کانپ رہے تھے۔ جنت نے کہا:

رض! سردی لگ رہی ہے، واپس چلتے ہیں۔'' دونوں سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے واپس کمرے میں آئے۔ خیالات کی ہم آہنگی نے قرب کی تپش نے اور امیر خسرو کے کلام کی طہارت نے ان دونوں کو کچھ دیر کے لئے خاموش کر دیا۔ خاموشی سے کافی بنائی گئی۔ پھر رضوان کی زبان کھلی۔

رضوان: ''یار! تم بھی کیا چیز ہو؟''

جنت: ''میں کون ہوں ہم نفساں؟ سوختہ جاں ہوں۔ کیوں زبان کھلواتے ہیں، رضوان۔

تکلیف نہ دے آہ! مجھے جنبشِ لب کی

میں صد سخن، آغشتہ بخوں، زیرِ زباں ہوں''

رضوان: ''بے شک یہ کمرہ شاہد ہے کہ انگریزی زبان ایک بھونڈی اور پھیکی زبان ہے''

جنت: ''زبان کو سردی لگ رہی ہے۔ پلیز کافی دیں۔''

رضوان نے کافی کا مگ جنت کے ہاتھ میں دیا۔

جنت: ''دن نکلنے والا ہے۔ شبِ وصال ختم۔

سگری رین مورے سنگ جاگا

بھور بھئی تو بچھڑن لاگا؟

بتائیے میں نے کیا کہا؟''

رضوان: ''ہم پر طنز ہے۔''

جنت: ''پھر سنیے۔

سگری رین مورے سنگ جاگا

بھور بھئی تو بچھڑن لاگا

اس کے بچھڑے پھاٹت جیا

اے سکھی ساجن؟ نہ سکھی دیا

اس کے بچھڑے پھاٹت جیا۔ 'پھاٹت' پھٹنے کو کہتے ہیں۔

رضوان: ''نہ بھئی! کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔''

جنت: "امیر خسرو کی پہیلی ہے اور پہیلی کا جواب بھی اسی میں چھپا ہوا ہے۔ آخری لفظ 'دیا'۔"

رضوان: "واہ، واہ۔ میں اس قابل نہیں کہ امیر خسرو کی تعریف کا حق ادا کرسکوں۔ اس معاملے میں جاہل ہوں، لیکن اس پہیلی کو اس موقعہ پر استعمال کرنا واقعی قابلِ ستائش ہے۔ بہت اچھے جنت"

جنت: "اچھا ایک اور پلیز، رض۔ دن نکل چکا ہے اور آج کی رات کا یہ خلاصہ ہے۔ پھر امیر خسرو آرہے ہیں، ہوشیار باش۔

سیج پڑی، میری آنکھوں آیا

ڈال سیج، مجھے مجا چکھایا

کس سے کہوں میں مجا اپنا

اے سکھی ساجن؟ نہ سکھی سپنا

رضوان: "یہ مجھ پر الزام ہے۔ ڈال سیج مجھے مجا چکھایا

کس سے کہوں میں مجا اپنا

حرام ہے جو میں اس پلنگ کے نزدیک بھی گیا ہوں۔"

جنت: "ارے پہیلی ہے۔ آخری لفظ پکڑلیں۔ 'سپنا' ۔ سپنے کی پہیلی ہے۔"

رضوان: "واقعی ہماری رات ایک ایسا سپنا ہے، جس کو کم ازکم میں نہ بھول سکوں گا۔ تم اپنے جھمیلوں میں پڑجاؤ گی۔ تم بھول جاؤ گی۔"

بیرن گھڑی سات بجا چکی تھی۔ دونوں نے منہ دھونے اور کپڑے بدلنے کا فیصلہ کیا۔ رضوان نے اپنے کمرے کا غسل خانہ پہلی بار استعمال کیا۔ غسل وغیرہ کرکے دوسرے کپڑے بدل کر دوبارہ جنت کے کمرے میں آئے۔ اس وقت تک جنت بھی نہا دھو کر مغربی جین میں ملبوس ہوچکی تھی۔ دونوں کی لال آنکھیں رات کے جاگنے کی غمازی کررہی تھیں۔ دونوں نیچے گئے اور ناشتے سے فارغ ہوئے۔

جنت: یہاں کی گھڑیاں تیز کیوں چلتی ہیں۔ لیجئے نو بج چکے ہیں۔ چار بجے میری روانگی ہے۔
ابھی ہمارے پاس سات گھنٹے ہیں۔"
رضوان نے جنت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کہا:

سگری رین مورے سنگ جاگی
بھور بھئی تو بچھڑن لاگی ؟

جنت: نمی دانم چہ منزل بود
شب جائے کہ من بودم

رضوان، جیسی بھی رات کٹی میری زندگی کا مائیہ ناز سرمایہ رہے گی۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے، یہ رات میری زندگی کی حسین ترین رات کٹی ہے۔ میری دو شادیاں ہو چکی ہیں اور میں کہتی ہوں، رضوان، جتنا میں اس رات کو ہنسی ہوں اپنی زندگی میں کبھی نہ ہنسی تھی۔ رضوان! بھور بھئی میں بچھڑن لاگوں۔"

رضوان کے آنسو نکل آئے، کہا: "آؤ، میں تمہیں کیمبرج دکھا دوں۔"

یہ کہہ کر دونوں پر مختلف موڈ سوار ہوئے۔ اب ایک ٹورسٹ تھا دوسرا ٹورسٹ گائڈ۔ دونوں ٹورسٹ بس میں بیٹھے اور تین گھنٹوں میں تمام کالجوں کی باہر سے سیر کر لی۔ دو بج چکے تھے۔ ابھی تک ان دونوں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ بہتر یہی سمجھا کہ واپس Court of Arms جا کر کھانا کھائیں اور وہیں سے ڈاؤننگ کالج جا کر بینی کے آنے کا انتظار کریں۔

ٹھیک چار بجے بینی کی کار آتی نظر آئی۔ جنت نے رضوان کی طرف خاموشی سے دیکھا اور کہا، "تھینک یو"۔ پھر کچھ سوچتی رہی۔ "خیال رکھیے گا۔ میں آپ سے نہیں ملی ہوں۔" رضوان نے کہا "سگری رین مورے سنگ جاگی، بھور بھئی تو بچھڑن لاگی۔" بینی نے ہارن بجایا۔ رضوان نے جنت کا بیگ کار میں رکھا۔ جنت نے ہاتھ اوپر کیا اور رضوان نے بوسہ دیا۔
"خدا حافظ"۔

اینی جہاں دیدہ Psychiatrist تھی، وہ صرف اپنے معائنہ سے Psychoanalysis کرنا چاہتی تھی کہ رات کو کیا گزری۔ وہ جنت کی چال کو، کار میں بیٹھنے کے انداز کو، اس کے بکھرے بالوں کو اور اس کی سرخ آنکھوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ بے شک جنت کی آنکھوں کے لال ڈورے شب وصال کی غمازی کر رہے تھے۔ ایک تجربہ کار انگریز پروفیسر کیلئے وصال ایک قدرتی عمل تھا اور مغربی قدروں کے لحاظ سے بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ لیکن جنت کی شکل پر جو ٹھہراؤ تھا اور جو سکون تھا، وہ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ اینی انتظار کرتی رہی کہ جنت کے جذبات بے قابو ہو کر اپنے رازدار کو وصال کی روداد سنائیں۔ جنت دل ہی دل میں دہرا رہی تھی "سگری رین موری سنگ جاگا، بھور بھئی تو بچھڑن لاگا"

کافی دیر کار میں خاموشی طاری رہی۔ آخر کار اینی نے سوال پوچھ ہی لیا کہ کیمبرج میں وقت کیسا گزرا۔ جنت نے دوٹوک جواب دیا کہ انٹرویو بہت اچھا رہا۔ کالج نے ایک مہینے میں رابطہ قائم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اینی نے پھر کریدا کہ پھر کیا ہوا۔ جنت نے پھر سوکھا جواب دیا کہ رات بہت چھوٹی تھی، بہت جلدی گزر گئی۔

Annie: "Where did you sleep?"

Jannat: "We hired a room with double bed in Court of Arms."

Annie: "He was with you?"

Jannat: "Yes"

اینی نے ہار پر ہاتھ مارا اور چیخی "Wow"

Jannat: "I would like to remind you, Bhabi Annie, that the girl in question is a religeous minded married girl with a strong character. The boy is mature decent gentleman, known to the girl from very childhood. Both of them behaved decently. I swear that none of us touched the bed. We spent the night reviving old memories. Did not sleep a wink last night. But, but our union has intoxicated us both."

Annie: "Jannat, I am not surprised. I know you."

Jannat: "I must thank you for being so thoughtful and arranging the meeting. We really needed this. Please keep this confidential."

Annie: "Jannat, I am not a child. I am an old hag. I know what's happening in my house."

Jannat: "I regard you as head of the family."

Annie: "Jannat, are you a brave girl? Can you withstand a horrible fact of your life?"

Jannat: "Oh No , Bhabi! What is the latest?"

Annie: "Jannat, your husband, Kamal, is not going to live long. Maximum life expectancy of Kamal, given by doctors, is six months."

Jannat: "Oh no, Bhabi Jan, Is that true."

اور جنت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

Annie: "Be bold Janat. This is life. You haven't started your life as yet. Learn to stand up and address your life as events come before you."

Jannat: "Bhabi, I feel tired now. I want some rest."

Annie: "Most important is that you give NO indications of your grief to Kamal or Jamal. Behave normally. Be happy and look after your husband."

Jannat: "Bhabi, Bhabi, Bhabi Annie, why did you arrange this meeting with Rizwan?"

Annie: "Now, you know it. Be bold. Show NO expressions on your face. We are approaching London."

جنت: ''یا اللہ مدد۔''

ہر کمالے را زوالے

کمال اپنے بھائی کے ساتھ بیٹھے چاء پی رہے تھے۔ عینی جنت کو لے کر گھر واپس پہنچیں۔ شام ہو چکی تھی۔ یہ دونوں عورتیں بھی اپنے میاؤں کے ساتھ چاء میں شامل ہو گئیں۔ کمال نے جنت کے انٹرویو کے بارے میں پوچھا تو عینی نے فوراً لقمہ دیا کہ انٹرویو بہت اچھا گزرا اور کالج ایک ماہ میں رابطہ قائم کرے گا۔ جنت نے بتایا کہ اس نے کیمبرج کے سارے کالج باہر سے دیکھے۔ چرچل کالج نہ جا سکی۔ بہت دور تھا اور وقت کم تھا۔ کیمبرج لندن سے بہت مختلف جگہ محسوس ہوئی۔ وہاں کے ۳۲ کالج، کالجوں کی صفائی، وہاں کے سبزہ زار اور وہاں کی فضا نے جنت کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ آج روز کی طرح ''کانفرنس'' نہ ہوئی۔ سفر سے دونوں خواتین تھکی ہوئی تھیں۔ عجلت میں کھانا کھایا اور جلدی سونے کا ارادہ ظاہر کر کے اپنے اپنے بیڈ روم میں سونے کے لئے چلی گئیں۔ ان کے شوہر جمال اور کمال اپنی باتوں میں مصروف رہے۔

کمال کے کمرے میں دو بیڈ تھے۔ جنت نے کبھی ڈبل بیڈ نہ استعمال کیا تھا کیونکہ کمال بہت خراٹے لیتے تھے اور ہمیشہ سنگل بیڈ پر سونے کے عادی تھے۔ تھکی ہوئی جنت اپنے کمرے میں

آئی، جلدی جلدی گرم پانی سے غسل کیا اور اپنے پلنگ پر دراز ہو گئی۔ پچھلی رات کی جاگی ہوئی تھی، لیٹتے کے ساتھ ہی نیند کا حملہ ہوا اور آہستہ آہستہ نیند گہری ہوتی گئی۔

جب کمال اپنے بیڈ روم میں آئے تو جنت بے خبر گہری نیند سو چکی تھی۔ انہوں نے اپنی منکوحہ کو غور سے دیکھا اور ایک حسین لڑکی کو محوِ خواب پایا۔ وہ اپنے بستر پر جا کر بیٹھ گئے۔ آج وہ جنت سے بہت باتیں کرنا چاہ رہے تھے، لیکن اس کو جگانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ لیٹ گئے اور سوچنے لگے کہ دیکھو رات کیسے گزرتی ہے۔ نیند آتی بھی ہے یا نہیں۔

کمال راتوں کو اکثر جاگتے رہتے تھے۔ کچھ اپنی بیماری کی تکلیف کی وجہ سے جوان کا جگر ان کو پہنچا تا تھا اور کچھ اپنے، اپنی بیوی کے ماضی کو سوچ کر یا اپنی بیوی کے مستقبل کو سوچ کر۔ یہ تینوں عناصر بہت تکلیف دہ تھے۔ انسان اپنے آپ کو کب تک دھوکا دے سکتا تھا، وہ اپنے آپ کو خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ جو نقاب وہ پہنے رہتے، اس سے باہر نکلنے میں وہ آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ آج ان کے درد جگر نے ان کے دل کو ٹٹولا اور انکو پلنگ پر بٹھا کر ان کے سامنے ان کی زندگی کی فلم چلا دی۔ انہیں دکھایا جا رہا تھا کہ وہ کیا تھے، کیا ہیں اور اب کیا ہو گا۔ وہ اپنی بیوی کے بارے میں سوچتے اور اپنے گریبان میں منہ ڈالتے۔ سوچنے لگے کہ جنت نے جو کچھ بھی موجودہ درجہ حاصل کیا ہے وہ اپنی ذاتی کاوشوں اور اپنی قابلیت سے حاصل کیا۔ اُس کے مقابلے میں کمال بذاتِ خود کچھ نہ تھے۔ ان کی حیثیت ہمیشہ دوسروں کی مرحونِ منت رہی۔ دہلی میں باپ کی دولت اُڑاتے رہے۔ سرکاری معمولی سی نوکری کر کے وقت گزارتے رہے۔ اصل میں تو وہی عیاش تھے۔ شراب پی پی کر انہوں نے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ اپنی عمر سے ۳۰ سال چھوٹی بچی کو، اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر، نکاح میں لے لیا تھا۔ آج ان کا ضمیر ان کو ملامت کر رہا تھا۔ ان کے ہمزاد کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا۔ وہ با آواز بلند سوالی تھا۔ فوری جواب مانگتا تھا۔ ان کا ہمزاد عتاب کی کیفیت میں ان کے جسم سے نکلا ان کے سامنے کھڑا ہوا اور پوچھا۔ "کیا یہ جھوٹ ہے" اور کمال نے اپنا سر تکیے میں چھپا لیا۔ تھوڑی دیر بعد مقابلہ

کرنے کی ہمت کی "وحت تیرے کی" کہہ کر اُٹھ کر بیٹھے اور اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کی جوانی کی گہری نیند دیکھ کر کمال کو رشک آیا۔ منہ سے نکلا "کیا گلہری کی طرح پھدکتی پھرتی ہے؟ اس کی جوانی دیکھو، اس کا حسن دیکھو، کیا یہ جھوٹ ہے؟ یہ میری ہے، ہمزاد۔ یہ میری ہے۔ میری جنت ہے۔" ہمزاد بولا "اٹھو! پُھرتی دکھاؤ، مرد ہو، شوہر ہو، جوان چھوڑ لیٹی ہے۔ کیا سوچ رہے ہو۔" خواہشِ نفسانی نے کروٹ لی اور کمال نے پلنگ پر سے اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن آہ بھری.....زیرِ لب بُڑبڑائے "یہ درد کہاں سے اُٹھتا ہے؟ دل ہے یا جگر۔" اور اپنا سینہ پکڑ کر لیٹ گئے۔ کنکھیوں سے پھر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ ہمزاد نے یاد دلایا "لونڈیا ہے لونڈیا! تم سے ۳۰ سال چھوٹی ہے۔ کیا کمزور ہو گئے ہو؟ " کمال زور سے چیخے "مرد ساٹھ سال کا بھی جوان.....اور زور زور سے کھانسنے لگے۔ ان کے چیخنے سے جنت کلبلائی، کروٹ بدلی اور نیند نے پھر اپنی آغوش میں لے لیا۔ کمال لیٹے لیٹے کھانستے رہے، بُڑبڑاتے رہے۔ "دوا تو کھائی تھی، درد کم کیوں نہیں ہوتا۔ دوا...دوا تو میری بیساکھی ہے۔ اگر بیساکھی.....بیساکھی ٹوٹ گئی۔ نہیں میں لندن میں ہوں، مجھے دوا ملتی رہے گی۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔" کھانستے کھانستے کروٹ بدلی۔ آنکھوں کو صاف کیا اور پھر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ پھر آنکھوں کو صاف کیا۔ بڑبڑائے "کیا چین کی نیند سو رہی ہے! یہ سترہ سال کی تھی .....جاہل سسرال .....قید میں ڈال دیا تھا.....ایسی چنچل کو... اُف تیری اُٹھتی جوانی.....ظالم تو نے مجھے قتل کر دیا تھا.....تیرا حسن.....اُف۔" ہمزاد چیخا "بوالہوس، عیاش! اپنے دوست کی بچی کو مشورہ دینے کے لئے بھیجا گیا تھا تجھے...بھول گیا؟ اس کی مجبوری سے، اس کی قید سے فائدہ اُٹھایا۔ بدمعاش...شرابی...اپنی دولت کا سہارا لے کر عیاشی کرتا رہا...تو واجب القتل ہے۔"

کمال پلنگ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑبڑ بڑبڑ کرکے کہا "کیا میں نے اس کی ...اس کی...زور سے چیخے **خدمت نہیں کی؟**" جنت کی نیند میں خلل پڑا۔ اس نے کروٹ

بدلی۔ گہری نیند میں اُٹھنے کی ہمت نہ ہوئی، سوتی رہی۔ کمال اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے تھے۔" حرام زادے...ہم زاد...بدذات۔ دیکھ...مجھ سے زیادتی نہ کر۔ حساب لگا...حساب لگا...کتنا روپیہ...میں نے اس کی تعلیم پر خرچ کیا ہے۔ پاؤنڈ خرچ کئے ہیں۔ کس کے لئے....

کس کے لئے....پھر چیخے **کس کے لئے؟**" ہمزاد نے قہقہہ مارا اور اپنی لال آنکھیں کمال کی آنکھوں میں ڈال کر کہا "اپنی چہیتی زوجہ کے لئے۔ کیوں کیا یہ جھوٹ ہے؟ لیکن کمال صاحب...کیا تم نے اس کا حقِ زوجیت ادا کیا؟ سچ بول...بوالہوس!" کمال غصے میں کھڑے ہو گئے۔ "آج میں تجھے قتل کر دوں گا۔ میرا درد ذرا سنبھلنے دے...ظالم...تجھے کچھ پتہ نہیں ...تو کچھ نہیں جانتا...وہ...وہ...وہ برف ہے۔ برف...برف...نہیں، وہ جوان...جوان ابھی نہیں ہوئی۔ برف ہے۔ قصور...قصور میرا نہیں۔" ہمزاد نے پھر قہقہہ لگایا "واہ کمال صاحب، تم ایک معصوم روح سے کھیلتے رہے ہو۔ تمہارے نفسِ حیوانی کے سامنے وہ برف نہ بنتی تو کیا بنتی؟ وہ جذبہ آتشِ سوزاں کی منتظر تھی۔ وہ چاہتی تھی اور چاہتی ہے کہ کوئی آئے اور اس کی برف پگھلا کر آبِ حیات بنا لے۔" "کمینے ہمزاد! میں نے اُردو ادب نہیں پڑھا....

انگریزی میں بول کیا چاہتا ہے۔" کمال نے اپنا سینہ اپنے ہاتھ سے دبوچا "یہ درد کہاں سے ہوتا ہے؟ اگر آج درد زیادہ ہے ...تو کمینے ہمزاد آج ہی ساری پول کھولے گا؟ اتنے دنوں سے کہاں تھا؟" "تمہارا ہمزاد تمہیں چھوڑ کر کہاں جاتا؟ ہر نازیبا حرکت پر تمہارے دل پر دستک دیتا رہا۔ اور تم دھتکارتے رہے۔ اب تم کمزور ہو اور میں مضبوط ہوں۔ آج تمہارے دل پر موگری مار کر پوچھتا ہوں کہ تمہاری پہلی بیوی مری تھی یا ....ماری گئی تھی؟" کمال چیخے: "**وہ نہیں یاد مجھ کو**"۔ جنت نے کروٹ لی، اُٹھ کر دیکھا تو کمال اوندھے پڑے ہوئے تھے اور ان کو بدخوابی ہوئی تھی۔ جنت نے کروٹ بدلی اور سو گئی۔ کمال کا ہمزاد نکل کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ "کتنی سہانی رات ہے اور تمہیں نیند آئی جاتی ہے! جاگو کمال جاگو! دیکھو تو سہی کیسی تتلیاں ناچ رہی ہیں۔ بازارِ حسن کی زمرد یاد ہے؟ آموں کا باغ اسی کیلئے تم نے بیچا

تھا نا۔ اس کو تو تم نے گھر میں ڈال لیا تھا نا؟"

ہمزاد، کمال کا ضمیر، بتا رہا تھا کہ حساب کا وقت قریب ہے، صبح ہونے کو تھی۔ الارم بولا۔ جنت اٹھی، غسل کر کے فجر کی نماز پڑھی۔ چپکے چپکے اپنے شوہر کے پلنگ کے پاس آئی، یہ دیکھنے کے لئے کہ کمال سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے۔ انکو جاگتا دیکھ کر ان کو سلام کیا اور پوچھا "طبیعت کیسی ہے؟ آپ کو رات بھر بدخوابی ہوتی رہی ہے۔ آپ بہت ڈسٹرب سوئے ہیں۔"

کمال نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "درد نا قابلِ برداشت ہے۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔"

ہسپتال

کمال کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ پہلا دن مختلف قسم کے ٹیسٹوں میں گزرا۔ دوسرے دن کمال نے سنبھالا لیا اور بہت خوش نظر آرہے تھے لیکن عنوانِ گفتگو ذرا ڈگر سے ہٹ کر تھے۔ جنت سے پوچھنے لگے کہ کیا وہ لندن میں خوش تھی۔ اس نے جواب دیا کہ اس کا لندن میں رہنا اور تعلیم حاصل کرنا، اس کے لئے اور اس کے خاندان کے لئے باعثِ صد افتخار تھا اور اس کے ذمہ دار صرف اور صرف کمال تھے۔

کمال: ''کیا شوہر کی حیثیت سے میں اپنا حق ادا کر سکا ہوں۔''

جنت: ''جتنا حق آپ نے ادا کیا ہے، کوئی شوہر اس سے زیادہ حق ادا نہیں کر سکتا۔ جتنی دولت آپ نے مجھ پر اور میری تعلیم پر خرچ کی ہے، میرے پورے خاندان نے مشترکہ طور پر اتنی دولت خرچ نہ کی ہوگی۔ میں آپ کی اور آپ کے خاندان کی بے حد شکر گزار رہوں۔''

کمال: ''ایک عقاب کی طرح میں نے ایک چڑیا کو اپنے اوپر بٹھایا اور سمندر پار لا کر چھوڑ دیا۔ یہاں گل ہیں، گلاب ہیں، گلزار ہیں، نشیمن ہیں، ہم صفیر ہیں۔ اب وہ عقاب لاغر ہو گیا ہے۔

واپس تم کو نہیں پہنچا سکے گا۔ تم یہاں خوش رہو گی نا؟"

جنت: "میری تمام خوشیوں کے ذمہ دار آپ ہیں اور میری خوشیاں آپ سے وابستہ ہیں۔"
اتنا ہی کہا تھا کہ جنت اپنے آپ پر قابو نہ پا سکی، رو پڑی۔ بیٹی آئی، جنت کی کمر تھپتھپائی اور اس کو برآمدے میں لے گئی۔

دوسرے دن، صبح پانچ بجے ہسپتال سے ٹیلیفون آیا کہ کمال پاشا کا انتقال ہو گیا ہے۔
انتقال کے وقت وہ ریسپریٹر پر تھے۔ جنت کے منہ سے نکلا "انا للہ و انا الیہ راجعون"۔
اس خبر پر جنت کا غم سے بُرا حال تھا۔ اس کو دلی صدمہ ہوا تھا، اس کو اتنی جلدی کی اُمید نہ تھی۔
وہ دل کی تمام گہرائیوں سے کمال کی شکر گزار تھی۔ ایک مددگار کی حیثیت سے، ایک راہبر کی حیثیت سے، ایک اچھے انسان کی حیثیت سے۔ وہ اونچی آواز سے یہ تمام باتیں دہراتی گئی۔
پھر اپنے سابقہ شوہر کے بڑے بھائی سے مخاطب ہوئی: "جمال بھائی میری کچھ درخواست ہے۔
میں مسلمان بیوہ ہوں۔ میری عدت شروع ہو چکی ہے۔ میں اس گھر میں، اپنی عدت کی مدت پوری ہونے تک قید رہوں گی۔ نہ بازار جاؤں گی نہ کالج اور نہ ہی اپنے شوہر کے جنازے پر۔
میں مسلمان ہوں، باہر جانے پر مجھے مجبور نہ کیجئے گا۔ دوسرے یہ کہ کمال نے بتایا تھا کہ ان کے سوٹ کیس میں انکی وصیت ہے۔ سوٹ کیس آپ خود اپنے ہاتھ سے کھولئے، میں نہ کھولوں گی۔
آپ لوگوں نے جس طور پر ایک اجنبی کو اپنایا ہے وہ بے شک شرافت کی ارتقاء ہے۔ مجھے ٹھکرایئے گا نہیں اور جمال سے لپٹ کر رونے لگی۔ بیٹھ گئی اور روتی رہی۔

انتقال کے چالیس روز بعد، جمال نے اپنے مرحوم بھائی کا سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے کمال پاشا کی وصیت نکال کر سب کو سنائی۔ کمال نے اپنے تمام اثاثے اپنی بیوہ جنت پاشا کے نام ٹرانسفر کر دیئے تھے۔ اس میں کوئی چوبیس ہزار پاؤنڈ لندن کے بینک میں تھے اور دہلی میں شہدرہ کی ۳۰۰ ایکڑ زمین، جو کمال کو ورثے میں ملی تھی، جنت کو دی گئی تھی۔ جمال نے بتایا کہ جنت فیملی وکیل سے رابطہ قائم کر کے ضروری کاروائی کرے۔

دخترِ جمال

جنت نے اپنی عدت احترام کے ساتھ شروع کی۔ جنت بنیادی طور پر نمازی تھی۔ روزانہ، ہر حالت میں کسی نہ کسی وقت کی نماز ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھار پانچ وقت کی نماز بھی ہو جاتی تھی۔ وہ روزانہ قرآن شریف پڑھ کر اپنے مرحوم شوہر کو بخشتی رہی۔

بیوہ کی حیثیت سے وہ کچھ حراساں رہتی تھی، کیونکہ اصل رشتہ تو ٹوٹ چکا تھا۔ صاحب خانہ، جمال نے جنت کی تنہائی کی کیفیت کو محسوس کیا۔ گھر سے نکالے جانے کے ڈر کو محسوس کیا اور ایک دن "کانفرنس" کے دوران بات صاف کر دی۔

جمال: "جنت، میں تم کو بیٹی کہنے کا اب حق رکھتا ہوں۔ جنت، میں نے کیا کہا؟ بتاؤ میں نے کیا کہا؟"

جنت: "آپ نے میرے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔"

جمال: "بیٹیاں اپنے بابل کے گھر سے کب جاتی ہیں؟"

جنت: "جب دوسرے گھر کی ہو جائیں... لیکن...."

جمال: "لیکن ویکن کچھ نہیں، آرام سے اس گھر کو سنبھالو۔ تم ہم پر کچھ بوجھ نہیں ہو۔ عینی تم کو پسند ہی نہیں کرتی بلکہ وہ تم کو چاہتی بھی ہے۔ تم نے اس کے دل میں جگہ کر لی ہے۔ کبھی دل میں یہ خیال نہ آنے دینا کہ عینی یا میں تم کو اس گھر سے جانے دیں گے۔ تم ماشاءاللہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو۔ پیسہ تمہارے پاس ہے، مستقبل تابناک ہے۔ دہلی جاکر کیا وہاں سڑو گی۔ آرام سے بیٹھو، تمہاری کٹھن زندگی ختم ہو چکی ہے۔ مستقبل خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ تم بھی لبیک کہو۔ جنت صاحب خانہ اور عینی سے مخاطب ہوئی:

Jannat: "Bhabi Annie and Jamal Bhai, I am most greatful to you for the love and respect you have given me. I was a lost stranger, poor and highly confused. Kamal held my hand and guided me to this door. You sheltered me, owned me, provided me guidance, provided me wealth and respect. I am most grateful to your family. I accept you as my guardians and father and you Annie Bhabi, as my confidant and mother, so help me God.

اللہ میری مدد کر۔

عدت ختم ہونے کے بعد جنت نے اپنے کالج دوبارہ جانا شروع کیا۔ کافی لیکچروں کا ناغہ ہوا تھا۔ پوری تندہی کے ساتھ کلاسوں میں مشغول ہو گئی۔ کمال کے انتقال کو پانچ مہینے ہو چکے تھے، لیکن رضوان کو ابھی تک اس المیہ کی خبر نہ ہوئی تھی۔ عینی نے جان بوجھ کر اس خبر پر پردہ ڈالے رکھا تھا۔ وہ عدت کے دوران، رضوان کی حاضری سے، جنت کو پریشان نہ کرنا چاہتی تھی۔ پانچ مہینے بعد عینی نے رضوان کو خبر دی کہ جنت بیوہ ہو گئی تھی۔

چار دن بعد، یونیورسٹی کالج میں جنت اپنی روزانہ کی کلاس سے باہر نکلی اور کافی پینے کے لئے کیفٹیریا پہنچی۔ دروازے پر خاموش مگر کچھ جانا پہچانا آدمی کھڑا تھا۔ جنت کچھ پریشان سی ہوئی۔ رک گئی اور کتابیں قرینے سے پکڑیں۔ بال ٹھیک کئے اور چہرہ پہچان لیا۔ پریشانی

اور بڑھی کہ اس وقت ایک بیوہ کے سامنے بچپن کا بے تکلف دوست کھڑا تھا۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اس وقت کتنا غمگین اور کتنا بے تکلف ہونا لازم تھا، توازن قائم کرتی ہوئی سنجیدگی سے آگے بڑھی۔

رضوان: ''ہیلو جنت، سلام علیکم۔''

جنت: ''وعلیکم السلام۔ آپ کب آئے؟ آیئے اندر آیئے۔'' اور دونوں کیفیٹیریا میں داخل ہوئے۔

رضوان: ''کمال کی خبر سُنی۔ بینی نے ٹیلیفون کیا تھا۔ بڑا صدمہ ہوا۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ اتنے بیمار تھے کہ یہ نوبت آجائے گی۔''

جنت: '' Liver Cancer تھا، بہت چھپایا، بہت تکلیف اٹھائی، آخرکار جان دے دی۔ لیکن جو کچھ بھی ہوا وہ بہت تیزی سے ہوا۔ بس چٹ پٹ سو گئے۔''

رضوان: ''اچھے آدمی تھے۔ اللہ اُن کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اگر آپکی اجازت ہو تو میں فاتحہ پڑھ لوں۔''

جنت: ''ہاں کیوں نہیں۔ ایک منٹ میں ذرا اپنا سر ڈھک لوں۔'' یہ کہہ کر جنت نے اسکارف نکالا اور اپنا سر ڈھک لیا اور فاتحہ کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ فاتحہ کے بعد رضوان بولے'' کمال کے بعد بینی کا اور جمال بھائی کا کیا رویہ ہے؟''

جنت: ''بہت اچھا، قابلِ تعریف۔ انہوں نے صاف الفاظ میں اور باآوازِ بلند مجھے بیٹی بنالیا ہے۔ میں پاشا خاندان کی بہت شکرگزار ہوں۔ رض آپ کو یاد ہے کہ میں تو کچھ بھی نہ تھی۔ جو کچھ بھی میں آج ہوں، میں پاشا خاندان کی مرہونِ منت ہوں۔''

رضوان: ''مجھے بھی بہت سلجھا ہوا خاندان لگا۔ تعلیم یافتہ اور شریف۔ میرے یہاں آنے کی وجہ یہ ہے کہ میں تمہاری عدت کے دوران تمہارے گھر نہ آنا چاہتا تھا، عدت اب ختم ہوگئی نا؟''

جنت: ''جی ہاں، مہینے سے زیادہ ہوگیا۔'' میں نے عدت احترام سے کاٹی۔ بالکل باہر نہ نکلی، بال ٹھیک نہ کئے۔ دیکھئے، میرے بال اب نہ کالے نہ سنہری۔ ابھی تک بالوں کو کلر نہیں کروایا۔

اب سوچ رہی ہوں کہ بیوہ ہوں، دوبارہ سے بالوں کو اپنے اصلی کالے رنگ پر جانے دوں۔ بیوہ پر پرکالا رنگ جچتا ہے۔''

رضوان: ''ارے یہ کیا! جنت اور اداس باتیں؟ بیوہ ہونا ایک تجربہ ہے، ہماری زندگی تجربوں کا مرکب ہے۔ بیوگی وہ تجربہ ہے جو بہت کم کسی کو ملتا ہے۔ اب تم زیادہ تجربے کار ہو۔''

جنت: ''ہم تو ہوش سنبھالتے ہی شادیوں کے تجربوں میں پڑے رہے۔ کبھی منگیتر، کبھی بیوی، کبھی مطلقہ، کبھی بیوہ۔ ہمیں تو جوانی میں کنوارہ رہنا نصیب ہی نہ ہوا۔ کچھ لوگ ہیں....!''

رضوان: ''جنت، معاف کیجئے گا مجھے جانا ہے۔ دو تین ضروری کام ہیں۔ میں آؤنگا۔''

جنت: ''ایک چھوٹا سا وعدہ کرتے جایئے۔ میرے بال تیزی سے کالے ہو رہے ہیں۔ تھوڑے دنوں میں سب کالے ہو جائیں گے۔ وعدہ کیجئے کہ میرے سارے بال کالے ہونے سے پہلے آپ آئیں گے۔''

رضوان: ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے سب بال کالے ہونے سے پہلے میں تم سے ملنے آؤنگا۔ انشاءاللہ۔''

"کانفرنس" اب جمال کے گھر کی خاص واردات بن گئی تھی۔ رضوان کا جنت کے کالج میں آ کر فاتحہ پڑھنے کی خبر جنت نے کانفرنس کے دوران سنائی اور بتایا کہ رضوان بہت مصروف ہو گئے ہیں اور ان کا مستقبل قریب میں آنا مشکل ہے۔

باتوں باتوں میں جمال نے بتایا کہ آنے والی بارہ تاریخ کو ہفتے کے دن ایک میلہ ہونے والا ہے جو قریب والے Battersea Park میں ہر سال منعقد ہوتا ہے۔

"یہ پارک تو آپ نے دیکھا ہے، جنت۔ سارے دن کا شغل ہوتا ہے، چھوٹوں بڑوں کے لئے۔ ہم دونوں تو جا رہے ہیں۔ کیا آپ بھی چلنا پسند کریں گی؟"

"بارہ تاریخ.......... ہفتے کا دن؟ ابھی نو دن باقی ہیں۔ میرے خیال میں ....؟ ہاں میں چل سکتی ہوں، کوئی اور خاص کام تو ہے نہیں (کچھ سوچنے کے بعد) اب مجھے بالکل نارمل ہو جانا

چاہیئے، میں چلوں گی۔"

اسی رات عینی نے رضوان کو جنت کی لاعلمی میں فون کیا کہ بارہ تاریخ کو ہفتے کے دن نزدیک والے پارک میں میلے میں جانے کا پروگرام ہے، اگر ہوسکے تو وہ ضرور آئے۔ رضوان کے لئے یہ کم نوٹس تھا۔ اس نے پکا وعدہ نہ کیا لیکن یقین دلایا کہ وہ میلے میں چلنے کی پوری کوشش کرے گا۔

گیارہ تاریخ کو رضوان کا ٹیلیفون عینی کے پاس آیا کہ وہ میلے میں چلنے کے لئے ان کے گھر آ رہا ہے اور کوشش کرے گا کہ صبح کے دس بجے تک جمال کے گھر پہنچ جائے۔ اس خبر پر عینی نے سوچا کہ اس میلے میں جنت کا ساتھ رضوان کو دینا چاہیئے۔ دوسرے لوگ کیوں کباب میں ہڈی بنیں۔ وہ اپنے میاں سے مخاطب ہوئی:

"Jamal, let us give a surprise to Jannat. She does not know that Rizwan is coming to fete. Let them go. Let us go some where else."

"Excellent idea."

ہفتے کے دن جنت ناشتہ کرنے کے بعد اپنے کمرے میں گئی۔ میلہ میں جانے کے لئے ابھی تین گھنٹے باقی تھے۔ وہ غسل خانے میں اپنی شکل دیکھنے گئی کہ وہ میلے کے واسطے کون سے کپڑے پہنے۔ شیشے میں اپنے عکس کے سامنے اپنے بال کھولے۔ بال کافی لمبے ہو چکے تھے۔ چھ مہینے میں تراشے نہیں گئے تھے۔ بال کالے ہو چکے تھے کیونکہ ان کو کلر نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے سارے بال کھول کر ہوا میں لہرائے اور پھر دیکھا۔ بال کالے ہو چکے تھے۔ گھنے تھے اور بہت لمبے ہو چکے تھے۔ اس نے دادی اماں کو یاد کیا اور اپنے کانوں پر سے بال ہٹا کر اپنے کان برہنہ کئے اور آئینے کے پاس آ کر سرگوشی کی "اچھی بچیاں اپنے کانوں کو بالوں سے نہیں ڈھکتیں۔ میری بچی، چٹیا ہمیشہ بہت سخت گندھی ہوئی ہونی چاہیئے۔" جنت نے بالوں کی چٹیا گوندھنے کی کوشش کی۔ بال کافی لمبے ہو گئے اس لئے چٹیہ گوندھی جا سکتی تھی۔ "جنت! چٹیا گوندھ لے میری بچی۔" جیسے وہ اپنے بالوں کو چٹیا میں تشکیل دے رہی تھی۔ بالوں کی ایک سنہری لٹ اُس کے ہاتھ میں

آئی۔ منہ سے نکلا "یہ تو ابھی تک سنہری ہے۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ میرے سارے بال کالے ہونے سے پہلے وہ ضرور آئیں...... یا اللہ..... تھوڑی سی لٹ ہی سنہری رہ گئی ہے........ آج اُن کو بھیج دے۔ کاش میں اُن سے ٹیلیفون پر بات کر لیتی۔ یا اللہ میلے میں بھیج دے اُن کو .... اگر انہوں نے یہ سنہری لٹ دیکھ لی تو وہ ان کو وفادار بنا دے گی کہ وہ سارے بال کالے ہونے سے پہلے میرے پاس آ گئے۔ اُن کو بھیج دے، یا اللہ۔" جنت نے اپنے کالے بالوں کے ساتھ، اپنی شکل پہلی بار دیکھی تھی۔ لمبے اور کالے بالوں کے ساتھ شکل مختلف لگ رہی تھی۔ گورے رنگ پر سیاہ زلفیں بہتر لگ رہی تھیں۔ "مجھے اب سیاہ اور لمبے بال رکھنے چاہئیں۔ بہت ہو گیا مغربی فیشن!" ابھی جنت اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ جنت نے دروازہ کھولا تو ینگی نے بتایا کہ جمال اور ینگی میلہ میں نہ جا سکیں گے۔ جمال کو گولف کلب کی میٹنگ میں بلایا ہے۔ میلہ بہت قریب ہے، جنت اکیلی چلی جائے۔ یہ کہہ کر ینگی واپس چلی گئی۔ اب جنت بہت اداس تھی۔ اپنے پلنگ پر لیٹ کر اپنی سنہری زلف سے کھیلتی رہی۔ "میں تجھے بیرن کہوں یا سہیلی؟ تو اگر کالی ہو گئی اور وہ نہ آئے تو میری بیرن بُرا ہو گا اور اگر تو سنہری رہی اور وہ آ گئے تو میری سہیلی ہو گی کہ ہم کو وفادار بنا دیا۔ جو کرنا ہے کر لے۔ اب میں میلے میں جا کر کیا کروں گی، یہیں لیٹے لیٹے تجھ سے کھیلے جاؤں گی، کھیلے جاؤں گی میری بیرن... میری سہیلی۔" اور سنہری لٹ کو اپنی انگلیوں پر لپیٹتی رہی۔ کچھ سوچتی رہی، کچھ کھیلتی رہی۔

پھر دستک ہوئی اور ینگی نے بتایا کہ وہ لوگ جا رہے تھے۔ جمال اور ینگی اپنے کام پر روانہ ہو گئے۔ اب جنت کا موڈ بہت خراب تھا۔ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ میلے میں جائے یا نہ جائے۔ گھر میں کبھی اس کمرے میں جاتی کبھی اُس کمرے میں جاتی۔ یکا یک گھنٹی بجی۔ اور جنت دروازہ کھولنے دروازے پر پہنچی۔ دروازہ کھولا..... خاموش بُت بنا ہوا ایک انسان کھڑا تھا۔ وہ انسان جس کے تصور سے، خیالات سے، دماغ سے، قابلیت سے، جسم سے اور سانس سے وہ خوب واقف تھی۔ جنت کے تمام حواس نے اس کو کچھ دیر کے لئے مفلوج کر دیا۔ اس کو ایسا لگا کہ

وہ چینی کی گڑیا کی طرح زمین پر گر کر پاش پاش ہوگئی تھی۔ جادو تھا جو جنت کے سر پر چڑھ گیا تھا۔ ایک عامل تھا اور دوسرا معمول۔ اور کسی کو پتہ نہ تھا کہ کون، کون ہے۔ اس طلسم کو ایک لفظ نے توڑا "جنت" جنت کا جسم ہلا۔ اس نے گردن گھمائی، پھر اپنے عامل کو دیکھا۔ دوپٹہ ہٹایا، بال ہاتھوں میں لئے سنہری لٹ کو انگلیوں پر لپیٹا، بالوں کو دکھاتے ہوئے کہا "اسلام علیکم، رضوان بڑے وقت پر آئے آپ۔ کالے بالوں میں صرف یہ بال سنہری ہیں۔ آیئے، اندر آیئے۔" دونوں اندر جا کر ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔ خاموش، جذبات نے سوچنے پر مجبور کیا کہ اب کیا کریں؟

رضوان: "جنت، کیسی ہیں آپ؟"

جنت: "ہائی لی کنفیوزڈ۔ مجھے یہ پتہ نہیں کہ آپ آ رہے ہیں یا میں جا رہی ہوں۔"

رضوان: "اگر ہم آئے ہیں تو آپ کو نہیں جانے دیں گے۔ اور اگر آپ جا رہی ہیں تو ہم ساتھ چلیں گے۔ جمال بھائی کہاں ہیں؟"

جنت: "وہ اور یمنی بھابی گولف کلب کی میٹنگ میں گئے ہیں۔"

رضوان: "کیا؟ گولف کلب کی میٹنگ میں؟ ان کو تو میلے چلنا تھا۔"

جنت: "آپ کو میلے کا کس نے بتایا؟"

رضوان: "یمنی بھابی نے۔ ٹیلیفون کیا تھا اور مجھے میلے پر مدعو کیا تھا۔ جبھی تو میں آیا ہوں۔"

جنت: "یہ بھابی یمنی کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔ مجھے کچھ نہیں بتایا گیا۔ مجھے وہ میلے پر جانے کی تاکید کرتی رہیں۔ مجھے آپ کے آنے کا نہیں بتایا اور اپنے میاں کو لے کر غائب ہوگئیں۔ آج کل وہ یمنی بھابی کم اور بھان متی زیادہ ہیں۔"

رضوان: "اچھا! میں تمہارے کام میں مُخل نہیں ہونا چاہتا۔ میں جا رہا ہوں۔"

جنت: "کہاں؟"

رضوان: "جہاں سے آیا تھا۔"

جنت: "میلے میں نہیں جائیں گے آپ؟"

رضوان: "نہیں کام ہے۔"

جنت: "پلیز۔"

رضوان: "تم چلی جاؤ، جنت۔"

جنت: "میں اکیلے جا کر کیا کروں گی؟ کام ہے۔ کام ہی کرلوں گی۔"

رضوان: "اچھا چلو، میں بھی چلتا ہوں۔"

جنت: "ایک شرط پر، سینڈوچ لے کر چلتے ہیں اور سینڈوچ آپ بنائیں گے۔"

میلے کا فاصلہ ان کے گھر سے پانچ منٹ کی چہل قدمی پر تھا۔ دونوں کھانے کا سامان لئے Battersea Park کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ دونوں ایک نئے انداز سے چل رہے تھے۔ دونوں کے درمیان فاصلہ کم تھا اور یہ فاصلہ کسی نہ کسی بہانے سے اور کم ہو جاتا تھا۔ یا تو اُس کے پیر لڑکھڑانے لگتے یا اس کی ٹھوکر میں کوئی نہیں پتھر آجاتا۔ نتیجاً ایک ہی لمحہ کہ ایک دوسرے کو سنبھال لیتے۔ ایک دوسرے کو سنبھالتے ہوئے، دو بچپنے کے ساتھی، بچوں کی طرح میلے پہنچ گئے۔

"پچھلے سال میں اس میلے میں آ چکی ہوں۔ کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔ وہی ہنگامہ ہوتا ہے جو کسی بھی میلے میں ہو سکتا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔"

رضوان: "ایسا کرتے ہیں کہ ایک پُرسکون جگہ جھیل کے کنارے ڈھونڈتے ہیں۔ گھاس پر بیٹھ کر گپ مارتے ہی۔ اور چاء پیتے ہیں۔"

دونوں جگہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے جھیل کے کنارے ایک خالی دیکھ کر جنت نے بے قرار ہو کر کہا: "رض، جلدی وہ بینچ ملو"۔ دونوں نے اس بینچ کو قابو کیا، اپنا کھانے کا سامان اس پر رکھ دیا اور بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خوش جھیل کے پانی کو دیکھتے رہے، پھر پانی کی لہروں کو دیکھا، جھیل میں بطخوں کو دیکھا، پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر، دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ آنکھوں کی پلکوں میں پلک

ڈنڈی کا عکس نظر آرہا تھا۔ اس پر سفر کرتے ہوئے یہ دونوں بغیر بولے اپنے ماضی میں سفر کرتے رہے۔ وہی صحن میں جھیل کی طرح پانی کھڑا تھا، مرغابیوں کی طرح صحن میں مرغیاں تیر رہی تھیں۔ جنت ناچ رہی تھی۔ دمادم مست قلندر.....خودکشی......

ایک معصوم کی جان بچانے کے لئے دبوچنا ضروری تھا۔ دونوں کے منہ سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہی چنگاری آج شعلہ بن کر بھڑک اٹھی تھی۔ کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ کسی نے بولنے کی ضرورت محسوس ہی نہ کی۔ آج دماغ کی لہریں ایک دوسرے سے ہم کلام تھیں۔ جھیل میں ایک تلخ پھڑ پھڑائی اوران دونوں کی دماغی لہروں میں انتشار پیدا ہوا۔ رضوان نے خاموشی کو توڑا "کہاں تک پہنچیں؟"

جنت: "کیمبرج میں تھی۔"

رضوان: "کیا تمہیں احساس ہے جنت کہ ہم دونوں اب اس سٹیج پر پہنچ چکے ہیں جہاں ایک دوسرے کے درمیان الفاظ کا ہونا بے معنی ہے۔ ہمارے دماغی ٹرانسمیٹر اپنے آپ آن ہوجاتے ہیں اوراپنے آپ پیغام بھی دیتے ہیں۔"

جنت: "آن آپ کرتے ہیں، میں تو ریسیو کرنے والی ہوں۔"

اور باتیں ہوتی رہیں۔ یہ دونوں کبھی جھیل کی شفافی کو دیکھتے اور کبھی پرندوں کی داستانیں سنتے۔ ڈال پر بیٹھے روبن کے جوڑے کو دیکھتے جو پرسے پر ملائے نغمے گا رہے ہوتے۔ اللہ کی مخلوق میں پیار دیکھ کر، رضوان نے ایک بھونڈا سوال جنت سے کر ہی لیا۔ "جنت، تمہارا مستقبل میں شادی کا کیا....ارادہ ہے؟"

جنت: "اپنی زندگی کے بائیس سال میں کسی کی منگیتر رہ چکی ہوں، کسی کی مطلقہ رہ چکی ہوں، کسی کی بیوہ رہ چکی ہوں، شاید کسی کے دل میں رہ چکی ہوں...... رضی میں بہت منحوس ہوں"

رضوان: "ارے کوئی نئی بات بتاؤ، یہ سب تو میں جانتا ہوں۔"

جنت: "مجھ بدن دریدہ سے کون شادی کرے گا، رضوان۔"

رضوان: "کیسا غلیظ لفظ تم نے اپنے لئے استعمال کیا ہے۔ شاید اس دُنیا میں کوئی ایسا بھی ہو جس کے لئے تم دُرِ ناسفتہ ہو۔"

جنت: "دُرِ ناسفتہ کو پرکھنے کے لئے تو کسی جوہری کو بلانا پڑے گا۔"

رضوان: "میں جوہری کو بلا سکتا ہوں، اس سے شادی کرلو گی؟"

جنت: "بہت مشکل سوال ہے، میرے ہم نفس!"

رضوان: "میں ابھی تو جواب نہیں مانگ رہا۔ لیکن جواب سوچ لو، صرف جوہری کو جواب دینا۔"

جنت: "رضی، حالات نے مجھے آپ سے، تم سے، بہت نزدیک رکھا ہے۔ میں نے آپ سے کبھی کوئی چیز نہ چھپائی۔ کبھی آپ سے جھوٹ نہ بولا اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ کبھی آپ سے جھوٹ نہ بولوں گی اور کبھی آپ سے کوئی چیز نہ چھپاؤں گی۔ اور یہ سب کہنے کے بعد میں دو تین باتیں بتا دوں۔ پہلی بات یہ کہ میں M.A. کی ڈگری حاصل کئے بغیر شادی نہ کروں گی۔ دوسرے یہ کہ میں ڈاکٹریٹ کر کے پڑھانا چاہتی ہوں اور تیسری یہ بات جو شاید آپ جیسے جوہری کو معلوم نہ ہو، میں Late Bloomer ہوں۔ میری زندگی میں میری دماغی پرورش بہت آگے اور تیز رفتار رہی ہے۔ میری جنسی پرورش کم اور سست رفتار رہی ہے۔ دہلی والے کہتے ہیں کہ "بیسی اور کھیسی"۔ یعنی بیس سال کی لڑکی کھِس چکی ہوتی ہے۔ میں بائیس سال کی ہو کر کہتی ہوں کہ میں اب بالغ ہوئی ہوں۔ میں چھچھوری چھچھوری کا رول کبھی ادا نہ کرسکوں گی۔ کیسی گندی باتیں کروا رہے ہیں آج آپ، اور مجھے آج کیا ہو رہا ہے کہ بکے جا رہی ہوں کیا کچھ۔ لیکن کیا کروں......اپنے ہمزاد سے، جو میرا ہمزاد بنتا جا رہا ہے، کیسے چھپاؤں؟ .....رضوان۔"

رضوان: "اچھا اپنے بالغ ہونے کی خبر بذریعہ تار بھیجنا۔ مٹھائی لے کر آؤں گا۔ ابھی تمہاری ڈگری میں چھ مہینے ہیں۔ جنت یہ چھ مہینے تو برسوں میں کٹیں گے۔ تب تک تو میں اپنی نوکری پر پُرانا ہو چکا ہوں گا۔"

جنت: ''کہاں ملی نوکری؟ اور مجھے بتایا تک نہیں؟''

رضوان: ''کیمبرج شائر میں ایک جگہ کا نام ہے Peston وہاں .Glaxo Lab کا پلانٹ ہے۔ کمپنی کا کوالٹی کنٹرول مجھے دیا گیا ہے۔ نوکری بہت اچھی ہے، مجھے اپنا کام پسند ہے لیکن سسٹم میں کافی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ چند ماہ بہت مشغول رہنا پڑے گا۔''

جنت: ''مٹھائی کدھر ہے؟ اچھا چلئے، ہم اسی بات پر منہ میٹھا کرتے ہیں۔ آئس کریم کھاتے ہیں۔ آیئے۔''

باتوں باتوں میں گھر کے بنے ہوئے سینڈوچ ختم ہو چکے تھے۔ دونوں اُٹھے اور آئس کریم کے اسٹال پر پہنچے۔ دونوں نے پیالے بھر بھر کر آئس کریم لی اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جب یہ دونوں میلے میں آ رہے تھے تو راستے میں انکو ایک دوسرے کا قرب حاصل کرنے کیلئے لڑکھڑانا پڑ رہا تھا۔ جھیل پر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لینا اچھا لگ رہا تھا۔ اب جب آئس کریم کو چمچے میں لے کر رضوان نے جنت کی طرف کیا تو جنت نے منہ کھول دیا۔

رضوان بولے: ''ہائے اللہ، میرے منہ کے سارے جراثیم تمہارے منہ میں چلے گئے۔ جاؤ جا کر کلی کر لو۔''

جنت: ''کونسے پہلی بار گئے ہیں۔ کیمبرج میں بھی جا چکے ہیں۔ کیا پتہ ان جراثیم کی پرورش میں زندگی گزارنی پڑ جائے۔''

جنت نے آئس کریم چمچے میں بھری اور رضوان کے منہ کے سامنے چمچ کر دیا۔ رضوان نے منہ کھول دیا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ کیمبرج کی ایک رات کی باتیں ہوتی رہیں۔

رضوان: ''اس رات سب سے سہانا وقت کونسا لگا؟''

جنت: ''فجر کا وقت، بھیگی بھیگی رات، آنکھوں میں نیند کا خمار، شبنم سے گیلے پیر...دھند میں لیمپ پوسٹ کی لائٹ کا غلاف۔ خنکی سے کانپتے ہوئے دو جسم، گرمائی ڈھونڈتے ہوئے دو ہاتھ اور زبان پر امیر خسرو کا ترنم:

ہر سُو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم

بڑے بڑے شاعر، بڑے بڑے افسانہ نویس اس سین کی گہرائی نہیں بیان کر سکتے۔

شب جائے کہ من بودم

یہ میری زندگی کا مایہ ناز خزینہ ہے۔ میں کبھی بھول نہیں سکتی۔"

رضوان: "اور شاید تمہاری زندگی کا بھیانک سین تمہاری خودکشی کی کوشش کا ہے۔"

جنت: "شاید، لیکن وہ سین بھی اتنا عزیز ہے کہ میں بھلانا نہیں چاہتی۔"

رضوان: "بھیانک سین کو بھلانا نہیں چاہتیں؟ ....لیکن کیوں؟"

جنت: "کیسے بھلا دوں۔ مجھے نئی زندگی دی جا رہی تھی۔ کسی کی فولادی گرفت، سانس کی گرمائی، کیسے بھلا دوں، رضوان۔"

رضوان: "لیکن تم تو بے ہوش ہو گئیں تھیں جب چوٹ لگی تھی۔"

جنت: "ہاں لیکن شعلوں سے جلنے کے بعد۔"

آئس کریم کھا کر دونوں جھیل کی طرف ٹہلنے نکلے۔

رضوان: "آج تمہارے چہرے پر نمایاں شادابی ظاہر ہو رہی ہے۔ گھر جا کر ذرا اپنا چہرہ دیکھنا۔"

جنت: "اتنی آئیس کریم کھاؤں گی تو کیا شادابی نہ آئے گی؟ شادابی پر شعر سنو۔"

رضوان: "ارے میں شاعری کے میدان کا شاہسوار نہیں، لیکن تمہارے منہ سے ضرور سنوں گا۔"

جنت: "یہ شعر آپ کے چہرے پر شادابی دیکھ کر عرض کر رہی ہوں۔ ذرا غور سے سنا۔"

اے چہرۂ زیبائے تو، رشکِ بتانِ آذری

ہر چند صفت می کنم، در حسن ازاں بالاتری

رضوان: "امیر خسرو؟"

جنت: "جی نہیں، اقبال ہیں.... چل رض گھر اپنے سانجھ بھئی چوندیس۔ میلہ پھیکا پڑ چکا ہے چلئے گھر چلتے ہیں۔"

رضوان: "ہم بھی کچھ عرض کریں، گھر جا کر گوری سوئے گی، منہہ پر ڈالے کیس"

دونوں کے قدم گھر کی طرف اٹھنے شروع ہو گئے۔ آج بہت سے پیغامات ایک دوسرے کو دئے جا چکے تھے۔ منزل پر شمع جلتی نظر آ رہی تھی۔ اب قدم بڑھانے کی دیر تھی۔

جنت: "رض، آج ہم بھی عینی بھابی پر رشک کرتے ہیں۔ آپ یہاں آئے ہی نہیں اور میں اٹوائی کھٹوائی لے کر سارا دن اپنے کمرے میں لیٹی رہی۔"

رضوان: "کیا دماغ پایا ہے! میں تو کیمبرج میں ہوں، میں آ ہی نہ سکا۔"

گھر کے دروازے پر پہنچ کر رضوان نے کہا کہ عینی بھابی کے لئے میں آج نہ آ سکا۔ اگلے ہفتے آؤں گا۔ دیکھو کیا کہتی ہیں۔" مجھے اب اجازت دو پلیز، جنت۔ مجھے کئی کام کرنے ہیں۔ میں گھر کے اندر نہیں آؤنگا۔ دیر ہو جائے گی۔"

جنت: "ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھیں، لیکن ایک منٹ۔ میں آپ کو ایک تحفہ دینا چاہتی ہوں۔ پلیز ذرا یہیں ٹھہریئے، میں ابھی آئی۔"

جنت اندر گئی، اپنے بالوں کو ٹٹولا اور سنہری لٹ کو ڈھونڈ کر اس کو الگ سے پکڑ کر قینچی سے کاٹا اور ربن میں باندھا۔ ایک کارڈ پر اپنا نام اور تاریخ لکھ کر اسکو بالوں کی لٹ کے ساتھ نتھی کیا اور لے کر نیچے آ گئی۔ رضوان انتظار میں کھڑے تھے۔ جنت رضوان کے قریب آئی، بہت قریب آئی اور رضوان کی پیشانی کو بوسہ دے کر کہا: "رض، آج کی ملاقات کی نشانی۔ یہ سنبھال کر رکھئے گا۔ میرے سارے بال اب سیاہ ہیں۔ اللہ حافظ۔"

رضوان کے جانے کے بعد جنت نے کپڑے بدلے۔ شلوار قمیض پہنی اور پلنگ پر آ کر لیٹ گئی۔ وہ اپنے آپ کو اس ایکٹنگ کے واسطے تیار کرنے لگی جو اسکو ینی کے سامنے، رضوان کے نہ آنے کی وجہ سے کرنی تھی۔ بوریت، اُداسی، مایوسی، نا اُمیدی، غصہ، ان سب کا مرکب بنا کر موڈ بنایا۔ وڈی کی فقیرنی کی طرح بال کھول کر پھیلا لئے اور پھر لیٹ گئی۔ کوئی گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ ینی گولف کلب سے واپس آ کر سیدھی جنت کے کمرے میں آ گئیں۔

Annie: "So, How did it go? "

Jannat: "Go what? He didn't turn up. He called me from from some restaurant. He had some appointment. I think he had a date with some girl. I could hear a female sound in the background. I have been resting in my bed since morning."

Annie: "Oh my God. I know these men!"

عینی غصے میں باہر چلی گئی۔

کوئی پانچ دن بعد رضوان کا ٹیلیفون عینی کے پاس آیا اور اس نے عرض کی کہ وہ جنت سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔ اس کی بات جنت سے کروادی جائے۔ عینی نے جنت کو آواز دی کہ وہ آ کر ٹیلیفون سنے۔ جنت نے عینی کی موجودگی میں ٹیلیفون اٹھایا۔

جنت: ''آپ کیوں نہیں آئے Fete میں؟''

رضوان: ''پول تو نہیں کھلی؟''

جنت: ''نہیں۔ میں بہت ناراض ہوں۔ آپ لڑکی کے ساتھ لنچ کر رہے تھے۔ لڑکی کے ساتھ آئس کریم کھا رہے تھے۔''

رضوان: ''۲۶ تاریخ کو کیا پروگرام ہے تمہارا۔ ہفتہ کا دن ہے، میں آرہا ہوں۔''

جنت: ''OK یاد رکھئے میں وہ لڑکی نہیں جسکے ساتھ آپ آئس کریم کھا رہے تھے۔ میں ایسی ویسی نہیں ہوں۔ اس کو کچا چبا جاؤں گی۔''

رضوان: ''غور سے سنو۔ شادی کرو گی؟''

جنت: ''آپ سوچ لیں، منحوس ہوں (بلند آواز میں) میں آپ کو ہمیشہ، بھوں بھوں (رونے کی آواز میں روتی رہی) میں اس کو کچا چبا جاؤں گی۔'' اور ٹیلیفون پٹخ کر رکھ دیا۔

Annie: "Jannat, get hold of youself. He is a responsible and busy man. I know, it must have been something real important. Shall I talk to him? "

Jannat: "No, No, No Bhabi! Let him call. Stupid man. He was trying to bully me."

جنت غصہ دکھاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اپنی ڈائری نکالی اور ۲۶ تاریخ پر Riz لکھ دیا۔ سوچنے لگی۔ آج ۱۷ تاریخ ہے۔ نو دن بعد ۲۶ تاریخ آئے گی۔ یہ دن کیسے کٹیں گے۔ یہ آدمی تو گلے پڑتا نظر آرہا ہے۔ بچپنے کا ساتھی، رضوان۔ **''عیش، بے یار مہیا نہ شود''**

میرا یار، میرا رقص۔

جنت کے دل میں نئی اُمنگ پیدا ہوئی۔ وہ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اپنے دل کی آواز سُنانا چاہتی تھی۔ ٹہلتی ہوئی غسل خانے چلی گئی۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ حافظ شیرازی کا یہ شعر پڑھا۔

بادہ و مطرب و گل مہیاست، ولے
عیش بے یار مہیا نشود، یار کجا است؟

آئینے! مسٹر آئینے، اب تم بے حس ہو گئے ہو۔ ننگی عورتوں کو دیکھ دیکھ کر بے حس ہو چکے ہو۔ بے وقوف! بے وفائی نہ کرنا۔ مجھے اب ان کی ضرورت ہے۔ کسی سے کہہ نہ دینا۔"

آئینہ: "ہوں، ہوں ہو۔ لیٹ بلومر معلوم ہوتی ہو۔ پُرانے فیشن کی معلوم ہوتی ہو۔ ہمارے سامنے تو جو آئی، ارلی بلومر آئی۔ آج کل ارلی بلومر کا رواج ہے۔ ہماری آنکھوں نے تو ایک گیارہ سال کی ارلی بلومر دیکھی ہے۔ چلو تمہارے پھپن بھی دیکھ لیں گے۔"

جنت: "مسٹر آئینے! مشورہ دو۔ وہ آرہے ہیں ۲۶ تاریخ کو۔ یاد رکھنا ۲۶۔ خاص موقعہ ہے۔ میں اپنے آپ کو کیسے پیش کروں۔"

آئینہ: "ہو، ہو، ہو۔ وہ آرہے ہیں ہیں تو جو کرتی آئی ہو وہ نہ کرنا۔"

جنت: "امیر خسرو نہیں ہو تم۔ سمجھے نہیں سمجھے۔ پہیلی نہ بوجھو۔ بتاؤ کیا کروں؟ کیسے سنگھار کروں؟"

آئینہ: "جو کرتی آئی ہو وہ نہ کرنا۔"

جنت: "میں اپنے بال کلر کرتی تھی۔ نہیں کروں گی۔ بال کٹواتی تھی۔ نہیں کٹواؤں گی۔ پتلون پہنتی تھی، نہیں پہنوں گی۔ شلوار قمیض پہنتی تھی وہ بھی نہ پہنوں؟ پھر کیا پہنوں؟ اچھا سمجھ گئی ساڑھی باندھوں ٹھیک۔ بال کُھلے رکھوں گی۔"

آئینہ: "جو کرتی آئی ہو وہ نہ کرنا۔"

جنت: "بال کٹوا نہیں رہی، کلر نہیں کر رہی، چٹیا گوندھتی تھی وہ بھی نہ گوندھوں؟ بال کھلے نہ رکھوں ؟ پھر کیا کروں؟

آئینہ "جو کرتی آئی ہو وہ نہ کرنا"

جنت: "پھر کیا کروں! اچھا اچھا سمجھ گئی۔ جوڑا باندھ لوں۔ اوہ تھینک یو! مسز آئینہ، میں ساڑھی پر جوڑا باندھوں گی۔ یاد رکھنا ۲۶ تاریخ۔"

دوسرے دن عینی نے رضوان کو ٹیلیفون کیا اور جنت کی بے حد ناراضگی کی ترجمانی کی۔ اس نے رضوان کو یقین دلایا کہ جنت بہت اچھی لڑکی ہے، لیکن بہت دکھی ہے۔ اس نے چھوٹی عمر میں بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔ رضوان، جنت سے بدگمان نہ ہوں۔ اس کو آ کر منا لیں۔ خوش ہو جائے گی۔ رضوان نے پہلے تو بے اعتنائی برتی، پھر کہا کہ وہ عینی کی بہت عزت کرتا ہے۔ کیونکہ یہ عینی کا مشورہ ہے وہ خاص طور پر آ کر جنت کو منائے گا اور اس کے واسطے ایک تحفہ لائے گا۔ جنت غصہ تھوک دے اور اچھے اچھے کپڑے پہن کر انتظار کرے۔ اسی مہینے کی ۲۶ تاریخ کو ہفتے کی شام کو پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ ٹیلیفون پر رضوان سے باتیں ختم کرنے کے بعد عینی نے جنت کو اپنے پاس بلایا۔

Annie: "You, still mad at Riz?"

Jannat: "Annie Bhabi, No body can bully me. I do not accept it."

Annie: "Jannat, Calm down. He is a good man. He is coming to apologize to you and explain his position. 26th of this month, Saturday. Are you happy now? 26th , Saturday evening. Put on clothes of his liking. You know his choice. Good Luck baby. 26th, Saturday."

Jannat: "Bhabi Bhan Mati, Thank you."

اور جنت خوشی میں ہنسے گی "بھابی بھان متی۔"

برسوں کا انتظار کرنے کے بعد آخرکار جنت کی ۲۶ تاریخ آ ہی گئی۔ صبح سے ہی

تیاریوں میں دن کو جوں توں شام کیا۔ جنت نے ساڑھی پہنی، جوڑا باندھا، کانوں پر سے ایک ایک بال چُن کر جوڑے میں چھپاں کئے۔ بندے نکالے، پھر اور لمبے بندے نکالے، کانوں میں آویزاں کئے اور آئینے سے پوچھا ''قابلِ قبول ہوں؟''

آئینہ: ''آج اس گھر میں ایک ہیرا آتا دیکھتا ہوں۔ کہیں وہ تو نہیں لا رہے۔ چھین لینا خوش رہوگی۔ ہاں! خیال رکھنا ساڑھی کا پلو سنبھالتی رہنا۔ تمہارا بلاؤز بہت لوکٹ ہے۔''

جنت: ''او تھینک یو تھینک یو مسٹر آئینے۔'' یہ کہہ کر جنت نے آئینے کو بوسہ دیا۔''

آئینہ: ''نیک بخت یہ کیا کیا؟ میرے منہ سے لپسٹک صاف کرو۔ مجھے ناپاک کر دیا۔''

جنت نے جلدی سے آئینہ صاف کیا اور تیزی سے عینی کے پاس پہنچی۔

Annie: "By any standard, Jannat, you are a very pretty girl. I wish you every success in your new venture, What time is he coming? "

Jannat: "I think, he should be here by 4 pm."

Annie: "Jannat, the way you have dressed yourself, you look like a VIP. Don't open door for him. I will open the door and welcome him. You remain in sitting room."

شام کے چار بجے کے قریب دروازے کی گھنٹی نے کسی کے آنے کی خبر دی۔ عینی نے جا کر دروازہ کھولا۔ رضوان نے بے ساختہ پوچھا:

"Hello Bhabi, where is Jannat? Is she still mad at me?"

Annie: "Oh No. She is fine. waiting for you. Come in, come in."

رضوان اندر آئے۔ ڈرائنگ روم کے دروازے پر جنت کھڑی تھی۔ سرو قد، ساڑھی میں ملبوس، گھنے بالوں کا جوڑا باندھے، لمبے لمبے بندوں کی گرفت میں دمکتا ہوا چہرا لئے وہ منزل کھڑی تھی جس کو کبھی نہ کبھی افسانوں کی زینت بننا تھا۔ جنت کے حسن نے رضوان کو ششدر کھڑا کر دیا۔ مسحور کے طلسم کو جنت نے توڑا۔ ''اسلام علیکم، رض۔'' بڑی مشکل سے رضوان کے منہ سے

نکلا ''وا ...وا...علیکم اسلام، جنت۔'' ہاتھ بڑھایا اور پھولوں کا گلدستہ جنت کے ہاتھ میں دیا۔
جنت نے دوسرا ہاتھ بڑھایا۔ رضوان نے سر جھکایا۔ آہستہ سے ہاتھ پکڑا اور بوسہ دیا۔
''آیئے، اندر تشریف لایئے۔'' کی پیروی کرتے ہوئے رضوان نے قدم بڑھایا تو دیکھا کہ
جمال ہنس رہے تھے۔ وہ سامنے کھڑے تھے مگر اس رضوان نے اپنی آنکھوں کا فوکس صرف جنت
پر ذوم کر رکھا تھا اور دُنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ جمال کو ہنستا دیکھ کر رضوان بھی ہنس پڑے اور
سلام علیکم کہہ کر ان کے بغل گیر ہو گئے۔ سب بیٹھ گئے۔ سکون چھانا شروع ہوا۔ جنت،
جنت لگنے لگی۔ نارمل لگنے لگی۔ دبستانِ سخن کھلا، باتیں شروع ہوئیں۔
سب نے میلے کے ذکر سے گریز کیا۔ آج صرف خوشگوار باتوں کا ورد ہونا قرار پایا۔
رضوان نے اپنی نوکری کے بارے میں تفصیلات بتانا شروع کیں۔ ایک کیمیائی کوالٹی کنٹرولر کی
حیثیت سے رضوان کے کندھوں پر غیر معمولی ذمہ داری ڈالی گئی تھی لیکن وہ بہت خوش تھا کہ حالات
اُسکے قابو میں تھے اور ان کا اسٹاف اُنکی عزت کرتا تھا اور کہا مانتا تھا۔ اس نوکری میں بری بات یہ تھی
کہ کبھی وہاں پر فالتو یا بور لمحہ نہ ہوتا تھا۔ ایک ہنگامے پر نوکری موقوف تھی، کام، کام اور پھر کام۔
رضوان باتیں کرتے جاتے اور جنت کی طرف نگاہ ڈالتے جاتے۔ کبھی کنکھیوں سے اور کبھی
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، کبھی صرف مسکرا کر اور کبھی ڈر کر کہ دیکھیں اب کون آتا ہے۔ امیر
خسرو یا حافظ شیراز۔ ''میں تو جنت سے کہتا ہوں کہ شعر و شاعری میں، میں جاہل ہوں۔''
جنت بولی: ''جاہل کا لفظ غلط استعمال ہوا ہے۔ آپ کو تو کافی اچھے شعر یاد ہیں۔''
جمال: ''آپ نے کب سُنے؟'' جنت ہڑبڑائی کہ بڑا راز کشا سوال کیا گیا تھا۔ جھٹ بولی
''جمال بھائی، بچپنے میں کافی شعر سنا کر مجھ پر رعب جمایا کرتے تھے۔ لیکن اب اتنے بڑے
سائنٹسٹ سے شعر و شاعری کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔''
جمال: ''رضوان صاحب! آج معلوم ہے آپ کے لئے کیا پکایا ہے جنت نے؟''
رضوان: ''بریانی یا قورمہ''۔

جمال: ''جی نہیں، قیمہ بھرے دمی بڑے۔ کہتی ہیں کہ یہ صرف دلی والے بنا سکتے ہیں۔
جامع مسجد کا نسخہ ہے۔ کھا کر دیکھئے گا۔ انکوان کی دادی اماں نے سکھائے تھے۔''

کھانا کھایا گیا۔ سب خوش تھے۔ کسی نہ کسی بات پر سب ہنس پڑتے۔ عینی نے اپنا چہرہ فروغ مے سے پہلے ہی گلستان کیا ہوا تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہکی اور غالب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں انہوں نے وہکی پی غالب کے اشعار سے گل فشانی شروع ہو جاتی۔ موقع محل دیکھ کر انہوں نے غالب کا شعر سُنایا:

لپک کے آتی ہے دعا بن کے Something
نو بہار ناز کو، جنت بخشے''

سب نے تالیاں بجائیں۔
جمال: ''عینی پلیز، نو مور وہکی۔''

کھانے کے بعد سب لوگ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھے اور باتیں ہوتی رہیں۔ عینی کو آمد ہوتی رہی۔ پھر کچھ سنجیدہ ہو کر رضوان، جمال سے مخاطب ہو کر بولے:
''میں نے سُنا ہے کہ آپ نے جنت کو بیٹی بنالیا ہے؟''
جمال: ''جی ہاں''
جنت: ''اور مجھے ان کی بیٹی بن جانے پر فخر ہے کہ مجھ جیسی بدنصیب اور ٹوٹی ہوئی ہستی کے سر پر ایک عظیم انسان نے سایہ دیا ہے۔ میں ان کا احسان کبھی نہ بھولوں گی۔ مجھے یہاں نئی زندگی بخشی گئی ہے۔''
رضوان: ''جنت یہاں موجود ہیں۔ ہم سب لوگ تعلیم یافتہ ہیں، مہذب ہیں، موڈرن سوسائٹی کے ممبر ہیں، مسلمان ہیں اور ہماری جڑیں پُرانی تہذیب میں نکلتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ میں مغربی روایات کو اپناؤں اور ایک خاتون کے آگے گھٹنے ٹیک کر ازدواج کی التجا کروں، میں مشرقی قدروں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، اور اُن کی روایات کو اپناتے ہوئے، آپ سے، جمال بھائی آپ

سے، ایک درخواست کرتا ہوں۔ مجھے آپ کی بیٹی کا ہاتھ چاہیئے۔ مجھے آپ اپنی غلامی میں لے لیں۔"

جنت نے ساڑھی کا پلو ٹھیک کیا، اپنا سر ڈھکا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔

رضوان: "جنت میرا پیغام سُن رہی ہیں۔ اگر ان کو اس رشتے سے انکار ہے تو یہیں بیٹھی رہیں۔ اپنی زبان سے اقرار کریں کہ ان کو یہ رشتہ منظور نہیں۔ اور اگر ان کو یہ رشتہ منظور ہے تو اُٹھ کر چلی جائیں۔"

جنت نے اپنی ساڑھی کو سنبھالا اور، سر ڈھکا اور اُٹھ کر چلی گئی۔

رضوان: "جمال بھائی! جنت نے اور میں نے اکٹھے ہوش سنبھالا ہے۔ جتنی اچھی طرح سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں، شاید ہی دو انسان ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے۔ ہم دونوں اپنی ازدواجی زندگی میں بہت خوش رہیں گے۔ میں جنت کو خوش رکھوں گا انشاءاللہ۔ میں چاہوں گا کہ آپ روائتی طور پر میرے سر پر ہاتھ رکھیں اور مجھے اپنا ئیں۔"

جمال اُٹھے۔ رضوان کے سر پر ہاتھ رکھا اور ان کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد عینی اُٹھیں اور روائتی بوسہ دیا۔

Jamal: "Annie you go and bring the fiancee of Rizwan to this room."

عینی جنت کے کمرے میں گئی ۔ جنت کے آنسو بہہ رہے تھے۔ عینی نے آنسو پونچھے اور اس کو ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ جنت پُرانی رسومات کو اچھی طرح سے جانتی تھی۔ آج ان کو دوبارہ اپنا کر ان پر عمل کرنے کے درپے تھی۔ اس نے گھونگٹ کے انداز میں اپنا سر ڈھکا اور بہت مستقل مزاجی سے، خاموشی سے سے، نپے تلے قدم اُٹھاتی جمال کے پاس پہنچی۔ انکے سامنے ادب سے کھڑی ہوئی اور ادب سے سلام کیا "آداب"، عینی یہ سب کچھ دیکھ کر بے تاب ہو کر بڑھی اور جنت کو گلے سے لگایا اور چمٹائے رکھا، پھر سب سے مخاطب ہوئی:

Annie: "For all purposes, Jannat is engaged to Rizwan. Why on earth, we don't have such traditions. Oh my God. It was very touching.

Jannat, Meri Beti, Congratulations. Rizwan, congratulations. Dono ko Mubarak"

رضوان نے جیب سے انگوٹھی نکالی اور جنت کو پہنا دی۔ جنت کا ہاتھ اُٹھایا اور بوسہ دیا۔ جنت نے رضوان کا چہرہ ہاتھوں میں لیا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ جمال نے دونوں کو صوفے پر بٹھایا۔ دونوں خاموش تھے۔ پتہ نہیں کیا سوچ رہے تھے۔ کافی دیر خاموش رہے۔ پھر جمال نے خاموشی کو توڑا۔

جمال: ''ہمیں پتہ ہے تم دونوں کیا سوچ رہے ہو۔ ہم پر بھی یہ وقت گزر چکا ہے۔ کچھ تو بولو۔''

جنت: شب تار است در رہِ وادیِ ایمن در پیش

آتشِ طور کجا؟ موعدِ دیدار کجا است

رضوان: ''لیجئے امیر خسرو آ گئے۔''

جنت: ''جی نہیں یہ حافظ شیرازی ہیں۔ میں اپنے جذبات کی ترجمانی اس سے بہتر نہیں کر سکتی۔''

Annie: "It sounds beautiful. What does that mean? "

Jannat: "Bhabi, It is a request for guidance. It means that this is a dark night and I am on a deserted road in the valley of Yemen. Where is the fire of Mount Sinai and where is Moses for my guidance."

Jamal: "Beautiful Jannat. Could you please repeat it."

شب تار است،

در رہِ وادیِ ایمن

در پیش

آتشِ طور کجا؟

موعدِ دیدار

کجا است

جمال: ''بہت خوب۔ بھائی رضوان خوشقسمت ہو کہ تمہارا گھر اشعار سے ہمیشہ معطر رہے گا۔
ہمارے گھر میں تو غالب روزانہ قتل ہوتے ہیں۔''

جنت، سر جھکائے اپنی انگلی میں اپنی انگوٹھی کو گھمارہی تھی اور گنگنا رہی تھی:

اے نسیم سحر، آرام گہِ یار کجا است؟

وہ رشتے جو کبھی بچپنے میں کچے دھاگے سے بندھے ہوئے تھے۔ آج مضبوطاری کی گرفت میں آ چکے تھے۔ طلاطم میں ٹھہراؤ آ رہا تھا۔ گرد وغبار کارواں میں سے منزل جھلک رہی تھی۔ رضوان بولے:

''بہت رات ہوگئی ہے، میں اب چلتا ہوں۔ آج یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ جو ہوا ہے وہ بہت متبرک ہے۔''

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ جنت کی زندگی کا نیا دن شروع ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس وقت پاکستان میں صبح ہو رہی ہوگی۔ اس نے رضوان کی بہن اور اپنے بچپن کی سہیلی کو لاہور ٹیلیفون کیا۔ ٹیلیفون ماہ نور نے اُٹھایا۔

جنت: ''نند صاحبہ، سلام علیکم''

ماہ نور سوتے سوتے اُٹھی: ''کیا بکواس ہے۔ کون ہو تم؟''

جنت: ''اپنی نند کو نہیں پہچانتیں!''

ماہ نور: ''کس کی نند، میں ٹیلیفون بند کر رہی ہوں...کون ہو؟ ارے جنت؟ جنت تم ہو؟''

جنت: ''ہاں بھئی کیا کریں رشتہ ہی ایسا ہوا ہے!''

ماہ نور: ''کہاں ہو تم اور کیا بک رہی ہو۔ کہیں دارو تو پینی شروع نہیں کر دی۔''

جنت: ''ہوش میں ہوں، میں رضوان سے شادی...نہیں...رضوان مجھ سے شادی کر رہے ہیں''

ماہ نور: ''ہائے اللہ، کیا کہہ رہی ہو؟ کب؟''

جنت: ''پتہ نہیں۔ منگنی ہوگئی ہے۔''

ماہ نور: ''کب ہوئی منگنی۔''

جنت: ''دو گھنٹے پہلے۔ سب سے پہلے تمہیں فون کیا ہے۔''

ماہ نور: ''اور شادی کب؟''

جنت: ''شاید چھ مہینے بعد۔ تب تک میرے ساتھ M.A. لگ چکا ہوگا۔''

ماہ نور: ''ہائے اللہ، میں بھائی جان کو ابھی ٹیلیفون کرتی ہوں۔''

جنت: ''ابھی نہ کرو، وہ سو رہے ہوں گے۔ اب سے پندرہ گھنٹے بعد ٹیلیفون کرنا۔ اس وقت یہاں رات کے ڈیڑھ بجے ہیں۔''

ماہ نو: ''لو! رضوان بھائی اب 'وہ' بن گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاید منگنی واقعی ہوگئی ہے۔ جنت مبارک ہو۔ میں پاگل ہو رہی ہوں۔ مبارک۔''

صبح اُٹھ کر جنت ناشتے پر پہنچی تو اینی نے غور سے جنت کی طرف دیکھا۔ چہرے پر شادمانی اور شگفتگی تھی۔ جنت اپنی ہنسی کو اور خوشی کو چھپانے میں ناکام رہی۔ اینی نے لقمہ دیا:

Annie: "Both of you have taken the right step. I think it is a perfect match and you will have a very pleasant married life. Let me see your ring."

جنت نے انگوٹھی دکھائی۔

Annie: "Jannat, it is a good size diamond. Look after this ring."

انگوٹھی دکھا کر جنت نے فرمائش کی کہ وہ اپنا کمرہ بدلنا چاہتی تھی۔ اس کمرے میں اس کے مرحوم شوہر رہ چکے تھے۔ کچھ اُداس یادیں، کچھ ناخوشگوار واقعات اس کمرے سے وابستہ تھے۔ بہتر ہوگا کہ اگر اس کو دوسرا کمرہ دے دیا جائے۔ اینی نے کہا کہ وہ جہاں چاہے رہے، اس کا اپنا گھر ہے لیکن پہلے بھی ایک مہمان نے شکایت کی تھی کہ اس کمرے کے غسلخانے کا آئینہ بولتا ہے۔ ایک گیارہ برس کی بچی کو بہت ڈراتا تھا۔ لندن کے بھوت بہت مشہور تھے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کی روح اس غسل خانے میں اٹکی ہوئی ہو۔ جنت کمرہ بدل لے اور جونسا کمرہ چاہے لے لے۔

ناشتے کے فوراً بعد جنت نے اپنی دوسری سہیلی مارلین کو، والتھم اسٹو کے نمبر پر ٹیلیفون کیا اور منگنی کی تفصیلات بتائیں۔ وہ بھی خوشی میں بار بار مبارکباد دیتی رہی اور جلد آنے کا وعدہ کیا۔

رضوان اور جنت نے مشترکہ فیصلہ کیا کہ انکی شادی، جنت کی ماسٹرز کی ڈگری لینے کے فوراً بعد ہونی چاہیئے۔ ۲۱ مئی کو کنووکیشن کی رسم ادا ہونی تھی۔ اس تاریخ کے بعد جمعہ کے دن شادی ہوسکتی تھی۔ ۲۹ مئی کو جمعہ پڑتا تھا۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ شادی ۲۹ مئی کو مناسب رہے گی۔ پورے خاندان میں اور احباب میں اعلان کر دیا گیا کہ رضوان کی شادی جنت کے ساتھ ۲۹ مئی کو ہوگی لہٰذا تمام انتظامات اس تاریخ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کیے جائیں۔ پاکستان سے رضوان کی بہن ماہ نور نے اپنے والدین کو لے کر آنے کا بندوبست شروع کر دیا۔ جنت کی انتھک کوششوں کے باوجود جنت کے خاندان کا پتہ نہ لگایا جا سکا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ یا تو یہ لوگ پاکستان جا چکے تھے یا ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ جنت ایک یتیم کی حیثیت سے شادی کر رہی تھی۔ اس معاملہ سے ایک پیچیدگی پیدا ہوئی۔ جنت کا نام کیا ہے؟ جنت اپنے باپ کا نام اپنے نام کے ساتھ لازم سمجھتی تھی، لیکن اب پاشا فیملی والے اسکی شادی کر رہے تھے۔ جنت نے اپنا نام ''جنت شہاب پاشا'' تجویز کیا جو سب کو پسند آیا۔ تمام کارڈوں پر لڑکی کا نام ''جنت شہاب پاشا بنت شہاب الدین'' اور لڑکے کا نام ''رضوان خان خلف سرفراز خاں'' قرار پایا۔

رضوان نے جنت کا جوڑا پاکستان سے بنوا کر منگوایا۔ خاص ہدایات دی گئیں اور تاکید کی گئی کہ کسی طرح بھی جنت کو جوڑے کے رنگ اور ڈیزائن کا پتہ نہ چلنے پائے۔ اس کو تب پتہ چلے جب وہ دلہن بننے کے لئے تیار ہونا شروع کرے۔ ماہ نور نے حسبِ ہدایت جوڑا بنوایا اور اپنے والدین کو لے کر لندن پہنچ گئی۔ جمعہ کی نماز مسجد میں پڑھی گئی۔ اس میں جنت، ماہ نور، رضوان کے والدین، جمال پاشا دوسرے نمازیوں کے ساتھ موجود تھے۔ نماز کے بعد رضوان خان کا نکاح جنت شہاب پاشا سے پڑھایا گیا۔ اس وقت تک جنت کو دلہن کا جوڑا نہ دکھایا گیا تھا۔

شام کو جمال پاشا نے لندن کے مشہور کلب Gavroche Club میں ریسپشن دینے کا بندوبست کیا تھا۔

شام کو جب دلہن بننے کا وقت آیا تو تب جا کر ماہ نور نے دلہن کے جوڑے کا سوٹ کیس کھول کر جنت کو دیا۔ جوڑے کا رنگ فیروزی تھا۔ جب رضوان نے دہلی کے ریلوے پُل پر نئی زندگی سے آشنا کیا تھا، اس وقت جنت نے فیروزی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس واقع کی یاد دہانی رضوان نے مناسب سمجھی تھی۔ جوڑے پر لا جواب کارچوبی اور کلابتون کا بھاری کام کروایا گیا تھا۔ سولہ سنگھار کر کے جب جنت ریسیپشن ہال پہنچی تو اس کے حسن و جمال سے حاضرین کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ دلہن کی قامت، اٹھان اور لباس کو دیکھ کر انگریزوں کو احساس ہو رہا تھا کہ مغلیہ سلطنت سے انہوں نے کیا چھینا تھا اور انہوں نے کیا نہ اپنایا تھا۔ انگریز آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے کہ اس دلہن کا تعلق کسی بہت پرانے شاہی خاندان سے معلوم ہوتا ہے۔

آج جنت کو اپنی دادی کے الفاظ یاد آ رہے تھے کہ شہاب الدین، غیاث الدین بلبن کی اولاد میں سے تھے۔ یہ سوچ کر تھوڑی دیر بعد جنت کے آنسو نکل پڑتے تھے۔ آج ریسیپشن کی شان و شوکت مہمانوں کی آن بان ثبوت دے رہے تھے کہ لندن میں شاید ہی ایسا ریسیپشن دیا گیا ہو۔ ایسے موقع پر جنت کے رشتہ دار کہاں تھے؟ اس کے ماں باپ کہاں تھے؟ کیا وہاں پر جنت کا کوئی رشتہ دار موجود تھا؟ اور جنت رو پڑتی۔ جنت کو یتیم کی حیثیت سے بیاہا جا رہا تھا۔ "اللہ کو یہی منظور تھا" جنت بار بار زیرِ لب دہراتی اور سنبھل کر اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتی۔ دلہن کی پُشت پر دو دلہن نما لڑکیاں، دلہن کو سہارا دیتیں اور سرگوشی کرتیں "جنت اپنے آپ کو سنبھالو" ان میں سے ایک تھی ماہ نور اور دوسری مارلین ولسن تھی۔

شادی کے بعد جنت اپنے شوہر کے ساتھ کیمبرج شائر میں جا بسی۔ اس کو ڈاؤننگ کالج میں Associate Professor of Oriental Languages پر تعینات کیا گیا تھا۔ یہ کالج رضوان کی فیکٹری سے اتنا نزدیک تھا کہ جنت اپنی کار میں گھر سے کالج روزانہ آ جا سکتی تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ لیکن اب وقت نے بھاگنا ختم کر دیا تھا۔ وقت میں ثبات پیدا ہو گیا تھا۔ تھوڑے عرصہ بعد جنت نے اپنی تھیسس لکھنی شروع کر دی اور آخر کار وہ ڈاکٹر رض کہلانے لگی۔ گوروں کی زبان پر جنت شہاب پاشا رضوان کا چڑھنا مشکل ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر رض اب اپنی زندگی کی اس ارتقاء پر پہنچ گئی تھی جس کا کبھی بچپنے میں اس نے خواب دیکھا تھا۔ اب وہ منزلیں نہ ڈھونڈتی تھی۔ اب اس کا زاویہ فکر اپنے دل کی طرف ہوتا۔ وہ کون تھی؟ اس کا خاندان کہاں ہے؟ ماں باپ کے ساتھ کیا ہوا؟ اور اکثر یہ سوچ کر بے قرار ہو جاتی۔ ایک روز بے قرار ہو کر اس نے اپنی لاڈو سہیلی مارلین کو ٹیلیفون کیا "مارلین میرے ماں باپ کہاں ہیں؟ تیرے بھی تو کچھ رشتے دار دہلی میں رہ گئے تھے۔ چل ان کو ڈھونڈتے ہیں۔ تیرا سارا خرچہ میں دوں گی۔ مجھ پر احسان کر۔ میرے ساتھ چلی چل۔ بیس پچیس دن میں واپس آ جائیں گے۔" مارلین نے اس مہم میں جنت کا ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا۔

دہلی

ڈاکٹر رض اور مارلین نے دہلی پہنچ کر ہوٹل میں قیام کیا۔ سفر کی تھکان کی وجہ سے کچھ نیند لے کر اٹھیں تو شام ہونے کو آئی تھی۔ ان دونوں نے ٹیکسی کی اور سیدھی ترکمان دروازے کے سامنے جا کر اتریں۔ رام لیلا کا میدان جو کبھی ہری بھری گھاس کی مخمل بچھائے رکھتا تھا کوڑے کرکٹ سے اٹا پڑا تھا۔ لب سڑک دونوں کھڑی ہو گئیں۔

''جنت یاد ہے یہ سرکلر روڈ ہوا کرتی تھی۔ اس کا نام بدل کر آصف علی روڈ کر دیا گیا ہے۔''

''مارلین! وہ دیکھو ہمارے کوارٹر! جواب کھنڈر لگ رہے ہیں۔ ان میں تو برسوں سے سفیدی نہ ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ اتنی پبلک کہاں سے آ گئی؟ کیا یہ سب سکھ مہاجر یہیں رہتے ہیں۔''

''جنت وہ دیکھو میر درد روڈ۔ وہیں پر تو تیرا کوارٹر تھا۔ پندرہ نمبر تھا نا؟''

''آ جا میرے پیچھے پیچھے، مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔''

کوڑے کے ڈھیر، سرسبز گھاس کے تختوں کو ڈھانپ چکے تھے۔ اکثر منہ پر رومال رکھ کر گزرنا پڑا۔ بار بار بچوں کا سامنا کرنا پڑا جو کہہ رہے تھے "میم، ٹورسٹ، ڈالر دیدے"

ایک کھنڈر کے پاس جنت رُک گئی۔ یہ تھا پندرہ نمبر کوارٹر۔ ایک بچہ آیا اور تنبیہ کر کے چلا گیا "بھوت گھر ہے! شام کا وقت ہے، اندر نہ جانا۔" دروازے پر بجلی کے تار سے گھنٹی کا بٹن لٹک رہا تھا۔ مارلین نے احتیاط سے بٹن کو پکڑا اور جنت نے گھنٹی بجائی۔ گھنٹی کام کر رہی تھی۔ بجی مگر کسی نے نہ سُنی۔ پھر بجائی تو اندھیرے میں ایک انسان کا ڈھانچہ بامشکل تمام اپنی ہڈیوں کو حرکت میں لاتا ہوا دور ہی کھڑا ہو گیا۔ نحیف آواز میں کہا "کون ہے؟"

مارلین: "شہاب صاحب یہاں رہتے ہیں؟"

"ہاں، کسی سے ملتے نہیں۔"

مارلین: "ہمیں ان سے ملنا ہے۔"

"کون ہیں (زور سے کھانستے ہوئے) آپ لوگ؟"

"میں ڈاکٹر ولسن ہوں اور یہ ڈاکٹر رض ہیں۔"

"ہم نے کسی ڈاکٹر کو نہیں بلایا (کھانستے ہوئے) یہ ملنے کا وقت نہیں"

"ہم لندن سے شہاب الدین صاحب سے ملنے آئے ہیں۔ پلیز ہمیں ملا دیں۔"

"ٹھہرو! کہہ کر ڈھانچہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

کوئی پانچ منٹ بعد برآمدے کی مدھم سی لائٹ جلائی گئی اور خواتین کو اندر بلایا اور خود کھانستا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ کھانستا ہوا بولا "شہاب الدین بیمار ہیں، ان کے علاج کے لئے .....آپ ڈاکٹروں کو .... کس نے بھیجا۔"

کیا ہم ان کو دیکھ سکتے ہیں؟"

"بیٹھ جایئے۔ میں نے مطلع (کھانستے ہوئے) کیا ہے۔ صبر کیجئے۔"

کمرے کی گھٹن سے ایک چمگادڑ پھڑ پھڑائی۔ چکر لگا کر جنت کے سر کے قریب سے

گزری اور باہر چلی گئی۔ اندھیرے میں ایک پرانی الماری رکھی ہوئی تھی۔ جنت نے اس الماری کو پہچان لیا۔ ڈھانچہ اُٹھا اور آہستہ آہستہ زمین پر پیر رگڑتا ہوا دوسرے کمرے میں جا کر غائب ہو گیا۔ جنت نے الماری کھولنے کی کوشش کی، الماری برسوں سے نہ کھلی تھی۔ زنگ آلود قبضوں سے آ نکلی، اندر مکڑی کے جالوں کا شہر بسا ہوا تھا۔ جنت نے کھجور کا پنکھا الماری پر سے اُٹھایا اور اس کی ڈنڈی سے جالے ہٹائے۔ وہاں ہاتھ کی بنی ہوئی ایک گڑیا بجی بیٹھی تھی۔ بے ساختہ جنت کے منہ سے نکلا ''گلشن! ابھی تک بیٹھی ہے۔ دُلہن بنی ہوئی۔ ابھی تک نتھ نہیں اُتاری۔''

پیچھے سے ایک بُڑھیا لکڑی ٹیکتی ہوئی آئی۔ ''ڈاکٹروں کو اندر بلایا ہے'' اور کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ جنت کمرے میں گئی۔ وہاں ایک بزرگ پلنگ پر دراز تھے۔ داڑھی بالکل سفید ہو چکی تھی۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ بار بار کھانس رہے تھے۔ بولنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ ٹمٹماتی روشنی میں انہوں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ کونسی ڈاکٹر ہیں آپ؟

جنت ہچکیاں لے رہی تھی۔ اپنے آپ کو سنبھال کر بولی ''ابا! جنت آئی ہے۔''

''کون جنت؟ میں دوزخی ہوں۔ یہاں جنت کا کیا کام۔ میری جنت کھو گئی۔ تم کون ہو، کونسی ڈاکٹر ہو؟''

''ابا! ابا! آپ کی بیٹی۔ آپ کی بیٹی جنت!''

شہاب الدین کچھ سوچنے لگے۔ عینک ٹٹولی۔ عینک نکالی، پھر غور سے دیکھا ''تو اپنے آپ کو جنت کہتی ہے؟ میری بیٹی کہتی ہے؟ اِدھر آ'' جنت کا چہرہ ہاتھوں لیا ''تو جنت ہے؟ اپنا بایاں پیر دکھا۔ اپنا مسّہ دکھا''

جنت نے اپنے بائیں پیر پر اپنا مسّہ دکھا کر بے تاب ہو کر اپنے باپ سے چمٹ گئی۔ زار و قطار رو رہی تھی۔ کمرہ سسکیوں سے بھر گیا۔ بڑھا باپ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ بیٹی بڑوں کی طرح اپنے اوپر قابو نہ پا رہی تھی، الفاظ کی گتھی دونوں کے گلے میں پھنس گئی۔

جنت کی کمر پر ایک بُڑھیا نے ہاتھ رکھا اور پوچھا ''کیا جنت کی لاش لائی ہو؟''

''اماں، اماں میں زندہ ہوں۔ آپ کی جنت زندہ ہے''

''جنت مرگئی، میری جنت مرگئی۔ دوپٹہ پہنتی تھی۔ اری بدنصیب تو نے دوپٹہ کیوں نہیں پہنا۔
تو عرب لگتی ہے۔ یہاں کیا لینے آئی ہے؟ اس بڈھے کا علاج کرے گی؟''

شہاب الدین بولے: ''جنت، تیری ماں پاگل ہو چکی ہیں۔ انہیں کچھ ہوش نہیں۔ تیری دادی کو
زبان پر فالج پڑا۔ سمجھتی ہیں، بول نہیں سکتیں۔ میری بچی جنت۔''

ماں: ''جو کچھ بھی تو ہے، اس بڈھے کو مار دے۔ اس کی پنشن میں لے لوں گی۔ بلبن کی
اولاد ہوں۔ غیاث الدین بلبن۔ نام سُنا ہے تو نے۔''

شہاب الدین نے اپنی چھڑی اُٹھائی، کھڑے ہوئے ''ادھر آ، ادھر آ۔ دیکھ
تیری دادی زندہ ہیں۔ بول نہیں سکتیں۔''

جنت کا ہاتھ پکڑ کر، باپ اپنی ماں کے پاس لے گیا ''اماں، دیکھو کون آیا۔ تمہاری پوتی، جنت''
دادی اماں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ خلا میں کسی کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہیں۔ جنت دادی سے
چمٹ کر رونے لگی۔ شہاب الدین نے اپنی ماں کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر تھپتھپایا ''اماں ...
جنت... پوتی.... جنت''

برگزیدہ خاتون کے ہاتھوں میں جنبش ہوئی اور ہوا میں ہاتھ اُٹھائے اور بیٹھنے کی کوشش
کی اور سسکیاں لے کر بچی سے چمٹ گئیں۔

شہاب الدین: ''اس کمرے میں نہ جانا بیٹی، وہاں ایک دق کا مریض رہتا ہے۔ اب تو اس کا
ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ زندہ ہے۔ تم جانتی ہو... واجد علی، تمہارا نامراد سابقہ شوہر۔''

''یہاں کیسے آ گئے؟''

''بیٹی، مومن علی اور ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا، یہاں دوسراہٹ کے لئے ہم نے رکھ لیا۔
گھر کا چھوٹا موٹا کام کر دیتا ہے۔''

جنت اور مارلین زیادہ دیر نہ ٹھہرے۔ رات ہو گئی تھی، انہوں نے دوسرے دن آنے

کا وعدہ کیا اور واپس ہوٹل میں آ گئیں۔

جنت بہت خوش تھی۔ اس کا خاندان زندہ تھا۔ جنت کا اپنے خاندان کی بے بسی دیکھ کر دل بھر آیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وقت کو واپس کر کے، اپنے خاندان کو دولت سے بھر دے۔ وہ اپنے خاندان کی سرپرستی کر کے بہبودی اور دولت نچھاور کرنا چاہتی تھی۔ وہ تین کام کرنا چاہتی تھی:

1: وہ اپنے والدین کو ایک نئے مکان میں شفٹ کرنا چاہتی تھی۔

2: وہ اپنے والدین کی خدمت کے لئے ایک مستقل نرس رکھنا چاہتی تھی۔

3: وہ شاہدرہ کی چار سو ایکڑ زمین، جو اس کو کمال پاشا کی طرف سے ملی تھی، اپنے باپ کے نام ٹرانسفر کرنا چاہتی تھی۔

ہندوستان کے حالات کافی بدل چکے تھے، اب وہاں ہر کام رشوت سے ہوتا تھا۔ ان حالات میں جنت کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ دونوں لڑکیاں، ہوٹل میں گہری سوچ میں پڑ گئیں۔ باتیں ہوتی رہیں۔ ایک بات اُبھر کر آئی۔ انہیں ایڈوائزر کی ضرورت تھی جو ان کی رہنمائی اور وکالت کر سکے۔ مارلین کو برین ویو آئی:

"جنت، جنت! انکل رچرڈ یاد ہیں؟ ان کا بیٹا ہم سے بڑا تھا۔ وہ ہمارے وقت میں وکیل بن چکا تھا۔ اس کو یہیں ہونا چاہیئے۔ اس کو ڈھونڈتے ہیں۔ اس کو ہم لوگ انکل بل کہتے تھے۔ ولیم نام تھا۔ ٹیلیفون ڈائریکٹری کہاں ہے؟"

ڈائریکٹری کے ورق پلٹ گئے۔ ولسن، ولسن، ولسن۔ رچرڈ، ولیم، ایڈووکیٹ۔

مارلین نے انکل بل کو ٹیلیفون کیا اور ہوٹل میں بلا لیا گیا۔

اور آخرکار جنت کا منصوبہ پورا ہو گیا۔

تمت بالخیر

URDU F ALI [illegible]
Ali, Sayyid Shafaat.
Jannat bībī : nāvil
Ludhyānah : Cetnā
Parkāshan, 2006.
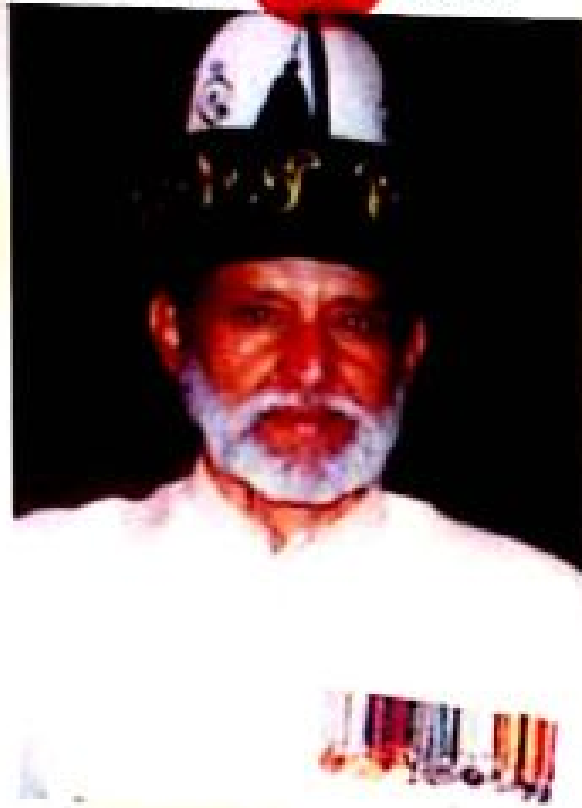
CHETNA PARKASHAN
Punjabi Bhawan, Ludhiana
(Punjab) INDIA
www.chetnaparkashan.com

JANNAT BI BI

ISBN 81-7883-260-7
INR 200/- $ 10